عکس بر عکس

ڈاکٹر محمد یونس بٹ





عکس بر عکس

ڈاکٹر محمد یونس بٹ

۲۰۰۳ء

• بے نظیر اکبر آبادی

بے نظیر اکبر آبادی مولانا حبیب جالب صاحب نے بھی نئی پارٹی کا اعلان کر دیا' جس کا نام انہوں نے "دعا پارٹی" رکھا ہے۔ یوں یہ واحد پارٹی ہو گی جس کا نام ہی اس کا منشور ہو گا۔ اگرچہ جالب صاحب کی صحت ایسی ہے کہ ہم سمجھے "دوا پارٹی" کہہ رہے ہیں' لیکن "دوا" کے شروع میں تو دو آتا ہے اور جالب صاحب اتنے بندے کہاں سے لائیں گے۔ بہرحال دعا پارٹی کا سن کر سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ اب تک ملک اس پارٹی کے بغیر چل کیسے رہا ہے؟ ایسا ہی ایک سوال' سیاست دان نے ایک ڈاکٹر سے کیا کہ انسان دماغ کے بغیر کتنے سال تک چل سکتا ہے۔ ڈاکٹر نے ان سے پوچھا "آپ کی عمر کتنی ہے؟"

حبیب جالب ہمارے وہ شاعر ہیں جنہیں مخالفین بھی حبیب ہی کہتے ہیں اور پھر یہ اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے نام میں ہی لب آتا ہے' کلام میں نہیں۔ مصائب جھیلنا ان کے لیے آسان ہے' البتہ خوشی جھیلنا مشکل ہے۔ آج تک کسی حکمران کے آگے سر نہیں جھکایا' ایک کے آگے جھکایا اور وہ اب تک ان کے گھر میں حکمران ہے۔ بے نظیر کے دوران حکمرانی میں' انہوں نے جب کہا "پاکستان میرے گھر کی طرح ہے" تو اس کا اشارہ اسی طرف تھا۔ ابھی تک ان کے گھر میں دوسرے گھروں سے آدھی سہولتیں ہی میسر ہیں' جیسے دوسروں کے گھروں میں سوئی گیس پہنچی ہے تو ان کے گھر میں ابھی صرف سوئی ہی پہنچی ہے۔ مالی حالت ایسی کہ اپنی کتاب تک نہیں خرید سکتے۔ ایسے ہی "پکاسو" کو کسی نے کہا کہ بڑے امرء کے ڈرائنگ روموں میں

آپ کی تصویریں لگی ہوئی ہیں' مگر آپ کے اپنے کمرے میں موجود نہیں' اس کی وجہ؟
پکاسو نے کہا "میری حالت ایسی نہیں ہے کہ میں اپنے ڈرائنگ روم میں اتنی مہنگی تصویریں "افورڈ" کر سکوں۔"

جالب صاحب کہتے ہیں "جب کوئی راستہ نظر نہ آئے تو فلم انڈسٹری چلا جاتا ہوں۔" ویسے وہاں اکثر لوگ ایسے ہی آتے ہیں جنہیں کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ کچھ کا ذاتی راستہ ہوتا ہے' جسے طے کرنے کے بعد وہ تہہ کر لیتے ہیں۔ ایک فلمی مصنف نے اپنے ہمسائے سے کہا "کیوں بھئی! تم نے میری فلم دیکھی' جس میں میاں بیوی کی مسلسل لڑائی دکھائی گئی ہے؟" ہمسایہ بولا "بھئی! میں نے فلم تو نہیں دیکھی' اس کی ریہرسل بارہا آپ کے گھر ہوتے دیکھی ہے۔" حبیب جالب صاحب نے بھی جو فلمیں بنائیں' ہمارے پورے معاشرے میں سب اس کی ریہرسلیں دیکھ رہے ہیں۔ اسی لیے مرحوم ریاض شاہد نے کہا تھا جالب معاشرے کو کوئی اتنی بڑی گالی دو جسے میں فلما سکوں۔

جالب صاحب وہ شاعر ہیں جو ساری زندگی امید سحر پر جیئے مگر صبح نہ دیکھ سکے' جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اٹھتے ہی دیر سے ہیں۔ ایک ایسے ہی پینٹر نے تصویر بنائی تو کسی نے دوسرے سے پوچھا "یار! یہ منظر کشی سورج کے طلوع ہونے کی ہے یا غروب ہونے کی؟" دوسرے نے کہا "غروب آفتاب کا منظر ہی ہو گا۔" پوچھا "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" بولا "میں اس کے مصور کو جانتا ہوں اور وہ کبھی اس وقت اٹھا ہی نہیں کہ سورج طلوع ہوتا دیکھ سکے۔" ویسے اس حساب سے تو یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ یہ غروب آفتاب کا منظر بھی نہیں کیونکہ مصور مشرق میں رہتا ہے اور سورج آج تک مشرق میں غروب نہیں ہوا' ہمیشہ مغرب میں ہوتا ہے۔ بہرحال جالب صاحب کے رات دیر سے آنے پر ایک دن ان کے والد صاحب نے پوچھ ہی لیا کہ تم رات رات بھر کن لوفروں کے ساتھ پھرتے رہتے ہو' مجھے تو ان سے ملاؤ۔ چنانچہ اگلی رات حبیب جالب مولانا عبدالستار نیازی صاحب کو ساتھ گھر لے گئے۔

جس دن جالب جلدی گھر پہنچ جاتے' گھر والے سہم جاتے کہ ضرور ان کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ یہی نہیں جب انہیں جیل گئے دیر ہو جاتی تو قیدی پریشان ہو جاتے کہ اللہ کرے ان کی صحت ٹھیک ہو' پہلے تو کبھی اتنی دیر نہیں لگائی۔ عدالت سے تو پرانا رشتہ ہے' جہاں دوسرے شاعر ڈیٹ پر جاتے ہیں یہ تاریخ پر جا رہے ہوتے۔ جج نے جب کبھی کہا کہ اپنی صفائی میں کچھ کہیں تو وہاں بھی شعر ہی کہے۔ جالب صاحب محبت کرنے والے شخص ہیں' اگر کسی کو غصے میں آ کر کہہ بھی دیں کہ جہنم میں جاؤ تو جونہی غصہ اترے گا فوراً کہیں گے جہنم میں نہ جاؤ۔

جیسے کسی نے کہا ہے کہ دنیا کی ساری عورتوں سے محبت کرنا ایک عورت سے محبت کرنے سے آسان ہے۔ ایسے ہی کسی آمر کے لیے سارے ملک کو منانا' اکیلے جالب کو منانے سے آسان تھا۔ اب یہی مولانا حبیب جالب اگر "میں نہیں مانتا" سے "میں مانتا ہوں" پر آ ہی گئے ہیں تو انہیں دوسری اہم پارٹیوں کو بھی اپنی "دعا پارٹی" میں شمولیت کے لیے منانا چاہیے۔ جیسے غلام فرید صابری صاحب کی قوال پارٹی' کیونکہ یہ ان پارٹیوں میں سے ہے' جس کے پاس ذاتی تالیاں بجانے والے موجود ہیں اور پھر جتنی بلند دعائیں وہ مانگتے ہیں' کس نے مانگی ہوں گی؟" "دعا پارٹی" کی صدارت کے لیے سابق گورنر مخدوم حسین قریشی صاحب سے بھی رابطہ کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ گورنر تھے تو انہوں نے بیورو کریسی کے بجائے "اللہ کرسی" رائج کی۔ وہ واحد گورنر تھے جن کے پاس سے کبھی کوئی خالی نہ آیا اور کچھ دیتے نہ دیتے دعا ضرور دیتے۔ ایک بار ان کے علاقے کا ایک شخص ان کے پاس آیا "سائیں وہ بچے کی ملازمت......" انہوں نے لفظ "ملازمت" ہی سنا تو ہاتھ اٹھا کر کہا "دعا کریں۔" اس شخص نے کہا "سائیں! سرکاری دفتر میں ملازمت مل گئی۔" تو مخدوم صاحب نے کہا "تو پھر دفتر کے لیے دعا کریں۔" ویسے یہ واحد پارٹی ہو گی جسے لوگ اپنے بچوں کی شادیوں پر بھی بلا سکیں گے اور کسی کے ہاں مرگ ہو گئی تو کہیں گے "دعا پارٹی بلاؤ' مرحوم کی روح بخشوانے کے لیے۔" حزب

اختلاف اپنے لیے دعائیں کرانے آ رہی ہو گی اور حزب اقتدار اپنے لیے۔ ہو سکتا ہے ایڈوانس بکنگ شروع بھی ہو گئی ہو ویسے ابھی تک یہ واضح نہیں کیا گیا کہ دعا پارٹی گھر گھر جا کر دعائیں دیا کرے گی یا لوگ خود اس کے دفتر آیا کریں گے۔ بہرحال اس پارٹی کو ابھی تک اگر کسی سے کوئی خطرہ ہے تو وہ کسی کاتب کی نکتہ آفرینی سے ہو سکتا ہے۔ یہ نہ ہو مولانا حبیب جالب کہتے پھریں:

ہم دعا لکھتے رہے اور وہ دغا پڑھتے رہے
ایک نقطے نے ہمیں محرم سے مجرم کر دیا

○○○

- مولانا ام الکلام آزاد

مولانا ام الکلام آزاد کو کون نہیں جانتا۔ شاید وہ نہ جانتا ہو جو لیڈی ڈیانا کو نہیں جانتا اور جو لیڈی ڈیانا کو نہیں جانتا وہ کچھ نہیں جانتا۔ بھارت میں جو شہرت کبھی پدمنی کولھا پوری نے شہزادہ چارلس کا بوسہ لے کر حاصل کی تھی' وہ مولانا نے شہزادی ڈیانا کو دوپٹہ اوڑھا کر حاصل کر لی۔ اب تو مولانا کی ڈیمانڈ اتنی بڑھ گئی ہے کہ تحریک آزاد قبائل اور قبائلی رہنما ملک کوکی خیل نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ مولانا کو ہمارے حوالے کیا جائے۔ تحریک آزاد قبائل کی بات تو سمجھ آتی ہے کہ تحریک اور مولانا میں "آزاد" قدرے مشترک ہے۔ مگر قبائلی رہنما ملک کوکی خیل سے ہمیں یہ توقع تھی کہ وہ مطالبہ کرتے کہ لیڈی ڈیانا کو ہمارے حوالے کیا جائے مگر انہوں نے مولانا کو ترجیح دی۔

لیڈی ڈیانا کے پاکستان آنے سے قبل ہی ہمیں ڈر تھا کہ ان کا دورہ بڑا نکاح توڑ ثابت ہو گا لیکن ہمارے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کی زد میں مولانا ام الکلام آزاد بھی آ جائیں گے حالانکہ وہ قادر بھی ہیں اور آزاد بھی۔ اگرچہ ہمیں اس بات کی کبھی سمجھ نہیں آئی کہ "حرکت" تو مرد کریں اور نکاح گھر بیٹھی بیوی کا ٹوٹ جائے۔ بہرحال مولانا نکاح ٹوٹنے کے فتوئی دینے میں اس عروج پر ہیں کہ شادی شدہ لوگ تو ان کے پاس سے گزرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔ وہ تو کئی غیر شادی شدوں کے نکاح بھی تڑوا چکے ہیں۔ شاید لیڈی ڈیانا کو مولانا کے پاس لایا اسی امید سے گیا ہو۔ ممکن ہے مولانا کا ڈیانا کو دوپٹہ اور قرآن پاک دینا' اس سلسلے کی کڑی ہو کہ لیڈی ڈیانا مسلمان ہو جائے اور شہزادہ چارلس کی چھٹی ہو جائے۔ ویسے بھی مولانا نے اپنے دست مبارک سے بڑے لوگ مسلمان کئے ہیں اور قوی امید تھی کہ ڈیانا بھی ایک دن ہو جاتی مگر دوسرے علماء کو فکر لگ گئی' حالانکہ فکر تو شہزادہ چارلس کو لگنا چاہیے تھی۔ مولانا

محمد حسین نعیمی چونکہ خود پاجامہ پہنتے ہیں' اس لیے انہوں نے کہا کہ ڈیانا کو دوپٹے کی بجائے پاجامے کی ضرورت تھی۔ مولانا نیازی نے کہا: "ڈیانا کی ٹانگوں کو چادر کی ضرورت تھی۔" گویا ان کے خیال میں شہزادی کو لاچا دینا چاہیے تھا۔ کچھ مولانا حضرات نے شلوار کا کہا۔ ویسے حکومت کو چاہیے تو یہ تھا کہ سب کو موقع دیتی۔ اگر حکومت نے ڈیانا کو براہ راست تحفے دینے پر پابندی لگا دی تھی تو کم از کم ایک علماء کمیٹی تو تشکیل دے دیتی جو متفقہ فیصلہ کرتی کہ ڈیانا کو شاہی مسجد کے دورے کے موقع پر کیا دینا چاہیے۔ اگر وہ دوپٹہ' شلوار' پاجامہ یا لاچا پر متفق ہو جاتے تو ایک اور کمیٹی بنائی جاتی کہ یہ لباس کس کپڑے کا ہو گا۔ یوں سب کچھ مل جل کر ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایسے ہی مولانا کا بچہ گم ہو گیا' وہ ڈھونڈنے نکلے تو بیگم کو کہا "تم بھی تیار ہو جاؤ' مل جل کر ڈھونڈتے ہیں۔" بیگم نے کہا "میرا جانا ضروری ہے کیا؟" تو مولانا نے فرمایا "آپ ساتھ نہ ہوئیں تو بچے کو پہچانے گا کون"" مگر بادشاہی مسجد میں جو ہوا' جلدی میں ہوا۔ جب گورنر جنرل غلام محمد تھے' ایک دن ان کو جمعہ پڑھانے والے مولوی نذیر احمد صاحب بیمار ہو گئے تو انہوں نے ملٹری سیکرٹری حامد نواز صاحب سے کہا' فوراً مولوی کا بندوبست کرو۔ وقت ہو گیا مگر مولانا نہ پہنچے تو ملٹری سیکرٹری کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ پتہ چلا کہ جب مولانا صاحب کو گورنر ہاؤس میں نماز جمعہ کی امامت کرنے کی اطلاع ملی تو انہوں نے خضاب لگایا' عربی جبہ زیب تن کیا اور پان کی گلوری منہ میں رکھ کر' شاہی موٹر میں سوار ہوئے۔ گاڑی کے شیشے اتنے شفاف تھے کہ مولانا صاحب نے آگے منہ کر کے پیک سڑک پر پھینکنا چاہی جو شیشے سے ٹکرا کر واپس مولانا صاحب کے چہرے مبارک پر آ گئی اور انہیں دوبارہ تیار ہونے میں دیر ہو گئی۔ دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے مگر مولانا صاحب نے اس سبب کے باوجود ریہرسل کے بغیر لیڈی ڈیانا کو دوپٹہ اوڑھا کر حاضرین سے داد حاصل کی۔ یہاں تک کہ جماعت اہل حدیث کے مولانا عبدالقدیر خاموش بھی خاموش نہ رہ سکے اور کہا کہ مولانا ام الکلام آزاد کو برطانیہ بھیج دیا جائے۔ مولانا اگر خاموش صاحب کے ساتھ ساتھ مولانا محمد حسین نعیمی اور مولانا نیازی

کی بات بھی مان لیں تو انہیں برطانیہ میں درس گاہ کھولنے کی بجائے ریڈی میڈ گارمنٹس کی دکان کھولنا پڑے گی۔

مارک ٹوئن کی بیوی بھی ہمارے علماء کی طرح لباس کے معاملے میں بڑی سخت تھی۔ وہ اکثر مارک ٹوئن کو ڈانٹتی کہ آپ بغیر ہیٹ کے صرف لمبی نیکر پہن کر کسی کے گھر مت جایا کریں۔ ایک بار وہ اس حالت میں ہمسائیوں کے گھر چلے گئے۔ واپس آئے تو بیگم نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ مارک ٹوئن فوراً اوپر اپنے کمرے میں گئے' ٹوپی اور پتلون لی اسے پیک کیا اور ایک ملازم کے ہاتھ اس نوٹ کے ساتھ ہمسائیوں کے گھر بھیج دیا کہ میں آپ کے ہاں بغیر ٹوپی اور پتلون کے آ گیا' آدھا گھنٹہ رہا جو چیزیں کم تھیں وہ اس پیکٹ میں بھیج رہا ہوں' سو میری بیوی کو خوش کرنے کے لیے انہیں آدھ گھنٹہ گھور کر لوٹا دیں۔ سو میرے خیال میں فی الحال مولانا ام الکلام آزاد صاحب کو پاجامہ اور چادر پیک کر کے لیڈی ڈیانا کو بھیج دینا چاہیے کہ جو چیزیں کم تھیں' بھیج رہا ہوں تاکہ سب لوگ خوش ہو جائیں۔ لیکن یہ سمجھ نہیں آتی کہ وہ ان قبائلی سرداروں کو کیسے خوش کریں گے جو کہتے ہیں "لیڈی ڈیانا کو دوپٹہ دینے سے ان کی بے عزتی ہوئی ہے۔" شاید ان کے خیال میں بندوق دینا چاہیے تھی۔ ایماڈنکن نے اپنی کتاب "بریکنگ دی کرفیو" میں لیفٹیننٹ کرنل حمید کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کی ایک قبائلی سے ملاقات ہوئی جو ملازمت سے پیسے کما کر گاؤں جا رہا تھا۔

"کتنے پیسے جمع کیے؟"

"پانچ سو روپے ہیں۔"

"ان کا کیا کرو گے؟"

"تھری ناٹ کی بندوق خریدوں گا۔"

"وہ اتنے پیسوں میں نہیں آئے گی' مہنگی ہے!"

"کوئی بات نہیں باقی رقم بیوی کو بیچ کر حاصل کر لوں گا۔"

"یہ تو بیوی کے لیے بڑی بدقسمتی ہو گی!"

"بس مجھے رائفل خرید لینے دیں، جونہی رائفل مل گئی اپنی بیوی واپس لے لوں گا۔"

سو صاحب! وہاں تو اتنی زبان نہیں چلتی جتنی بندوق چلتی ہے۔ پھر وہاں کے جرگے کا کیا پتہ، کیا فیصلہ دے دے۔ ایک گویے کو جرگے نے حکم دیا کہ وہ ساری رات قیدیوں کو موسیقی سنایا کرے۔ تو کسی نے پوچھا "اس گویے کو یہ کس جرم کی سزا دی گئی" جواب ملا "یہ گویے کی نہیں قیدیوں کی سزا ہے" سو قبائلی مولانا ام الکلام آزاد صاحب کو اپنے قبیلے میں لے جانا تو چاہ رہے ہیں مگر ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا کہ یہ سزا کس کو ہو گی؟

○○○

- تہمینہ کھر

ہمیں آج تک پتا نہ تھا کہ مرد کی تصویر بنانا اتنا مشکل کام ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے رہے کہ عورت تو مرد کی تصویر آنکھیں بند کر کے بنا سکتی ہے بلکہ وہ خاتون بھی بنا سکتی ہے' جسے مصوری آتی بھی نہ ہو۔ ایک مشہور امریکی مصورہ ایسی ہے جس سے جب کسی چیز کی تصویر صحیح نہ بن سکے تو وہ اس تصویر کو "مرد" کا عنوان دے دیتی ہے۔ ایک بار وہاں کی ایک سیاسی پارٹی نے اپنے انتخابی نشان "گدھے" کے پوسٹر بنانے کا انعامی مقابلہ کروایا تو اس خاتون نے گدھے کی تصویر بنائی جو اس قدر بری تھی کہ اسے مقابلے میں شامل ہی نہ کیا گیا' مگر اس نے اس تصویر پر "مرد" عنوان دے کر اس سال کی مصوری کا بڑا مقابلہ جیت لیا۔ تہمینہ درانی جو چاہے بھی پی رہی ہوں تو لگتا ہے' انکشاف کر رہی ہیں۔ انہوں نے انکشاف کیا ہے کہ میں نے بارہا مردوں کی تصویریں بنانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ ویسے ان کی لائف ہسٹری کے حساب سے تو انہوں نے صرف "دوبار" مردوں کی تصویر بنانی چاہی مگر کبھی اچھی نہ بنی۔

صاحب! اچھی تصویر وہ ہوتی ہے جو ایسی نہ ہو جیسے آپ ہوتے ہیں' بہتر لگے۔ ڈاکٹر روبن کولمبیا یونیورسٹی کے بڑے بااصول اور سخت پروفیسر مشہور ہیں' اس لیے طلبہ انہیں پسند نہیں کرتے۔ ایک بار طلبہ نے ان کی شادی کی سالگرہ پر انہیں ایک گدھے کی تصویر بھیجی تو پروفیسر صاحب نے واپسی میں انہیں اپنی تصویر بھیجی' جس کے نیچے لکھا تھا کہ آپ کا اپنی تصویر بھیجنے کا شکریہ' میں بھی اخلاقاً اپنی تصویر بھیج رہا ہوں۔

ویسے تو ہمارے مصوروں کے لیے خواتین کی تصویریں بنانا مسئلہ ہی رہا ہے۔ محمد حنیف رامے کو عورتوں کی تصویریں بنانے پر جیل بھی جانا پڑا۔ ہمارے ایک دوست نے فلمی اداکاراؤں کے پورٹریٹ بنائے۔ بابرہ شریف کا ایک اور انجمن کے تین ------- تو بابرہ شریف نے کہا۔ "آپ نے اس کے تین کیوں بنائے؟" تو مصور بولا "وہ ایک میں پوری نہیں آتی

تھیں کیونکہ ان کی تو ایک قوس بھی کوس کی ہے۔" ہو سکتا ہے آپ کہیں کہ آپ کے نزدیک ہی کیا' ہر عورت کے نزدیک تصویر بنانا مشکل ہے' البتہ ذرا دور یہ اتنا مشکل نہیں رہتا لیکن صاحب' نیچرل تصویر پھر بھی نہیں بن سکتی۔ ایک مصور نے کسی کی بیوی کی تصویر بڑی محنت سے بنائی' لیکن اس کے خاوند نے تصویر دیکھ کر کہا "یہ نیچرل نہیں۔" مصور نے پوچھا "آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" وہ بولا "اس تصویر میں میری بیوی کا منہ بند ہے۔" سو اگر تہمینہ درانی صاحبہ سے عورت کی تصویر نہ بنتی تو بات بنتی تھی۔ ویسے عورت کی تصویر بنانا' مردانہ کام ہے۔ جیسے کسی نے کہا "بشریٰ رحمٰن صاحبہ کو مردانہ نفسیات پر عبور ہے۔" تو دوسرے نے پوچھا "زنانہ نفسیات پر کیوں نہیں؟" جواب ملا "یہ تو مردانہ کام ہے۔"

تہمینہ درانی ان خواتین میں سے ہے جنہیں ایک بار دیکھو تو ایک بار ہی نظر آتی ہیں۔ صحت ایسی کہ بندہ ان کی تعریف بھی کر رہا ہو تو دیکھنے والا یہی سمجھے گا کہ عیادت کر رہا ہے۔ دیکھنے میں کسی رنڈوے کی پہلی بیوی لگتی ہیں۔ ہمیشہ "کھری" باتیں کرتی ہے۔ یہاں "کھری" سے مراد وہی ہیں' جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ انکی پینٹنگز دراصل ان کی کتاب "مائی فیوڈل لارڈ" کا ہی تصویری ایڈیشن ہیں۔ یہ تصویریں وہ جواب ہیں' جن کے ہمیں سوال دینے ہیں۔ امریکی آرٹسٹ ایڈورڈ ہوپر نے کہا ہے "جو کچھ آپ لفظوں میں کہہ سکتے ہیں اس کو پینٹ کرنے کی کیا ضرورت؟ کیونکہ پینٹنگ بنانا تو اندھوں کا کام ہے۔ پینٹر وہ نہیں دکھاتا جو اس نے دیکھا ہوتا ہے بلکہ وہ دکھاتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے۔" سو "مائی فیوڈل لارڈ" میں جو کسر رہ گئی تھی' ان تصویروں سے پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صاحب! ہم سمجھتے ہیں انسان کو زندگی میں صرف ایک بار اپنی غلطیاں اور خامیاں کم کرنے کا موقع ملتا ہے اور یہ اس وقت جب وہ اپنی آپ بیتی لکھتا ہے۔ تہمینہ نے فیوڈل لارڈ لکھ کر ان میں اضافہ کر دیا۔ اب وہ تہمینہ کھر بنی اپنی کھری غلطیوں کا تخمینہ ہی

لگا رہی ہیں۔ یہ کرنٹ افئیرز کی کتاب نہیں لیکن اس میں کرنٹ بھی ہے اور افئیرز بھی۔ وزیر ثقافت شیخ رشید صاحب نے اس کتاب کو "پریم کوک شاستر" کہا ہے' جس سے اور کسی بات کا پتا چلے نہ چلے شیخ صاحب کے "وسیع" مطالعے کا پتا ضرور چلتا ہے۔

کسی مصور کی سب سے بڑی دشمن' اس کی بری تصویر ہوتی ہے جو اکثر اسے مار دیتی ہے۔ ایک مصور سے کسی نے پوچھا "آپ اپنے رنگوں میں کیا ملاتے ہیں جو اتنا غیر معمولی تاثر ملتا ہے؟" پینٹر نے کہا "میں ان رنگوں میں اپنا دماغ ملاتا ہوں۔" تہمینہ نے درد ملایا ہے' یاد رہے یہاں درد سے مراد خواجہ میر درد نہیں ہیں۔ امریکی فلم ڈائریکٹر رابرٹ اسمین نے کہا ہے "فلم میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کا ایک آغاز اور ایک انجام ہوتا ہے جبکہ تصویروں میں وہ کہانی ہوتی ہے کہ جب تک آپ چاہیں دیکھ سکتے ہیں۔" تہمینہ کی تصویروں کی نمائش پر ایک شخص بڑی دیر سے ایک تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ آخر تھک کر کہنے لگا "وہ تصویر جو کرسی پر پڑی ہے وہ مجھے سب سے زیادہ ٹریجک لگی۔" تو دوسرے نے کہا "صاحب! وہ تصویر نہیں مصورہ ہے۔"

پورٹریٹ کے لیے ماڈل ضروری ہوتا ہے۔ ہمارا ایک دوست جو صرف جانوروں کے پورٹریٹ بناتا ہے' اس نے ایک سیاست دان سے کہا کہ میری خواہش ہے کہ میں آپ کا پورٹریٹ بناؤں تو سیاست دان نے کہا "مگر آپ تو کہتے تھے کہ مجھے کوئی لاکھ روپیہ بھی دے تو جانوروں کے علاوہ کسی اور کی تصویر نہ بناؤں' اب آپ کا وہ دعویٰ کہاں گیا؟" مصور نے کہا "آج کل میں اپنے دعویٰ کے ثبوت اکٹھے کر رہا ہوں۔"

خواتین ماڈلز تو بہت "مہنگی" ہوتی ہیں جنہیں "سستی" شہرت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے' لیکن تہمینہ اپنی تصویروں کی ماڈل بھی خود ہی ہیں۔ یوں وہ پہلی مصورہ ہیں جن کی گیلری میں لٹکی تصویریں دیکھ کر لگتا ہے' مصورہ لٹکائی ہوئی ہے۔ شاید وہ کسی اور کو لٹکانا چاہتی ہوں' حالانکہ محترمہ نے "مائی فیوڈل لارڈ" میں تو یہ بڑی کوشش کی ہے۔ ویسے مردوں کی تصویریں نہ بنا سکنے کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ جب بھی مرد کی تصویر بناتی ہیں'

"شیر" کی بن جاتی اور وہ کسی جانور کی تصویر بنانا نہیں چاہتیں۔

○○○

• سرکار جی

سرکار عبدالقیوم صاحب نے ہمارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔ ہم سوچ رہے تھے ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔ کسی نے کہا "کبھی کوئی غلط کام نہ کرو۔" سوچا غلط

کام نہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بندہ کوئی کام ہی نہ کرے' کیونکہ کام کرے گا تو اس کے غلط ہونے کا اندیشہ ہو گا اور پھر کوئی کام نہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بندہ سرکاری ملازم ہو' لیکن سرکار جی نے ہمیں ذہنی سکون حاصل کرنے کا اپنا نسخہ بتا دیا۔ کہا "اخبار نہ پڑھو۔"

سنا ہے' سرکار جی اپنے نام کے ساتھ "ڈھونڈ عباسی" لکھتے ہیں۔ شاید یہاں ڈھونڈ کا اشارہ سکون کی طرف ہے۔ سو وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ شاید اسی لیے صدر ضیاء الحق انہیں اپنا مرشد کہتے تھے۔ ہو سکتا ہے انہیں مرشد کہنے کی وجہ یہ ہو کہ جتنی دیر سرکار جی صدر رہے ہیں' ضیاء الحق صاحب بھی اتنی دیر صدر رہنا چاہتے ہوں۔ اب صدر ان کے نام کا حصہ ہی بن گیا ہے۔ کسی سے پوچھو آزاد کشمیر کا وزیراعظم کون ہے تو جواب ملے گا "صدر عبدالقیوم۔" وہ کشمیر کے مجاہد اول بھی ہیں اور انہیں مجاہد اول نیلابٹ کے مقام پر گولی چلانے کی وجہ سے نہیں' صرف چلانے کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔

ان کا گھریلو ماحول شروع ہی سے ایسا تھا کہ کوئی پوچھے "کبھی جی لگایا" تو کہتے ہیں "ایک بار" ان کے گھر ایک بزرگ آئے۔ انہوں نے سرکار جی کو بلایا تو موصوف نے آگے سے "جی ہاں" کہا مگر کسی وجہ سے والد صاحب "جی" نہ سن سکے اور انہوں نے سرکار جی کو "جی" نہ لگانے پر بڑا جی لگا کر مارا۔ تب سے وہ ہر جگہ جی لگا دیتے ہیں۔ ہم نے بھی سرکار صاحب کے ساتھ اسی لیے جی لگایا ہے۔ بچپن سے ہی ان کا حافظہ ایسا تھا جو چیز ایک بار پڑھ لیتے' یاد ہو جاتی۔ سو جہاں دوسرے طلبہ ضروری سوال یاد

کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہوتے یہ غیر ضروری سوالوں کے بھولنے کی کوشش کر رہے ہوتے۔

پڑھائی میں اس قدر تیز تھے کہ میٹرک کر لیا تو پتا چلا کہ مڈل تو کیا ہی نہیں' سو آج تک مڈل کلاس میں نہیں رہے' چھٹی جماعت سے سیدھے نویں جماعت میں داخل ہوئے۔ ویسے تو ان کے بڑے ریکارڈ ہیں جو ان کے مخالفین اکثر لگاتے رہتے ہیں' تاہم یہ شروع سے ہی ریکارڈ توڑتے آئے ہیں۔ شروع ہی سے ان میں آئیڈیل خاوندوں والی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ گھر میں جھاڑو دینا' کھانا پکانا اور برتن دھونا' سب کام کر لیتے ہیں۔ اب تو مہمانوں کے لیے بھی کھانا پکا لیتے ہیں۔ مصروفیت کا یہ عالم رہتا ہے کہ ان کی بیوی اکثر کہتی ہے "آپ دورے پر گھر کب تشریف لا رہے ہیں؟" جتنی دیر کرسی پر رہے' اتنی دیر تو بستر پر بھی نہ رہے ہوں گے۔ ویسے بھی رات کو زمین پر سوتے ہیں اور صبح زمین سے اٹھتے ہیں' حالانکہ ہمارے اکثر سیاست دان ایسے ہیں جو سوتے تو پلنگ پر ہیں' پر صبح اٹھتے زمین سے ہیں۔

وہ مجاہد ہیں جنھوں نے عمر بھر مجاہدہ کیا۔ یاد رہے یہاں مجاہدہ سے مراد مجاہد کی مونث نہیں ہے۔ کہتے ہیں "میں آج بھی بڑے دفاعی ماہرین سے زیادہ دفاعی معاملات پر عبور رکھتا ہوں۔" اس لیے ہمیشہ دفاعی حالت میں ہوتے ہیں۔ جب چلہ کشی کا موڈ ہو' جیل چلے جاتے ہیں۔ دیکھنے میں امام مسجد اور گفتگو میں سردار جی لگتے ہیں۔

کشمیر کے لیے اپنے کیے گئے کاموں کی تفصیلات بتاتے ہیں تو بندہ سمجھنے لگتا ہے' وہاں برف باری ہونا بھی ان کی حکمت عملی کا نتیجہ ہے۔ سرکار جی ایک چھوٹا سا ملک ہیں' جس کے شمال' جنوب' مشرق اور مغرب میں بھی سرکار جی ہی واقع ہیں۔ ویسے ہو سکتا ہے سرکار جی خود اس لیے اخبار نہ پڑھتے ہوں کہ پڑھنے سے نظر کمزور ہو جاتی ہے اور سرکار جی کی پہلے ہی نظر ایسی ہے کہ عینک لگائے بغیر تو وہ دور تک سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان کے پاس اتنی عینکیں ہیں کہ ان کو سنبھالنے کے لیے انھیں اتنی ہی محنت کرنا پڑتی ہے' جتنی اپنی حکومت کو۔

اخبار تو تاریخ کا پہلا رف ڈرافٹ ہوتا ہے۔ اخبار نہ پڑھنا اپنے بارے میں لاعلم رہنا ہے اور لاعلمی ہزار نعمت ہے۔ شاید اسی لیے نپولین نے کہا تھا "چار مخالف اخبار ایک ہزار بندوقوں سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔" اخبار کی افادیت کا تو ہمارا وہ دوست بھی قائل ہو گا' جو کہتا تھا "اخبارات نے اندھیر مچا رکھا ہے۔" یہ کہنے کی وجہ تو شاید یہ تھی کہ "اخبارات" میں لفظ "رات" بھی آتا ہے۔ اس دوست کا بٹوہ گم ہو گیا' جس میں قیمتی کاغذات تھے۔ اس نے ہمیں کہہ کر اخبار میں بٹوے کی گمشدگی کا اشتہار دیا اور اگلے ہی دن ہمیں شکریے کا فون کر کے کہا "آج ہی اخبار میں اشتہار چھپا اور آج ہی بٹوہ مل گیا۔" پوچھا "کیسے اور کہاں سے ملا؟" تو بولے "دوسرے کوٹ کی جیب میں تھا۔"

ہو سکتا ہے اخبار پڑھنے سے سرکار جی کی مراد یہ ہو کہ آج کل اخبار پڑھنا فیشن میں نہیں رہا۔ ہمارے بڑے اداروں نے اس کام کے لیے ایسے ہی ملازم رکھے ہوئے ہیں جیسے اپنی حفاظت کے لیے کاشکوف بردار۔ یوں بھی لوگ آج کل یہ نہیں کہتے "کوئی مجھ سے پوچھے' حکومت اور اخبار میں زیادہ ضروری کون سی چیز ہے تو میں کہوں گا اخبار۔" اگرچہ ہمیں یہ تو پکا پتا نہیں کہ وہ اخبار کیوں نہیں پڑھتے' بہرحال اخبار نہ پڑھنے کی ایک وجہ تو یہ بھی ہو سکتی ہے جو ایک مریض نے ڈاکٹر کو بتائی۔ ڈاکٹر نے اخبار فاصلے پر رکھ کر کہا "اسے پڑھو" مریض نے کہا "میں نہیں پڑھ سکتا۔" ڈاکٹر نے اخبار اور قریب کر دیا۔ مریض نے پھر وہی جواب دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اخبار اور قریب کیا مگر اس کا جواب وہی تھا۔ ڈاکٹر نے اسے مختلف نمبروں کی عینکیں لگانا شروع کیں ہر بار اسے کہتے "اب پڑھو!" آخر مریض نے کہا "میں اخبار کیسے پڑھوں جب کہ مجھے پڑھنا آتا ہی نہیں!"

○○○

• مسکراہٹ بیگم

بی وی اور ٹی وی میں یہ فرق ہے کہ ٹی وی کی نشریات کے محدود اوقات ہیں' جبکہ بی وی کے معاملے میں یہ سب آپ کی اوقات تک محدود ہے' لیکن بی بی سی ٹی وی ایک تو بی بی اوپر سے ٹی وی گویا بہت ہی ٹی وی۔ گزشتہ دنوں بی بی سی نے بڑی بی' سی بات کی۔ اس نے ایک ایسا پروگرام نشر کیا جسے دیکھ کر ہم ابھی تک مسکرا رہے ہیں۔ یہ پروگرام نامی گرامی گلوکارہ مس سینڈی کا تھا۔ یہاں گرامی سے مراد گراموں میں موصوفہ کا وزنی ہونا نہیں' اگرچہ وہ دیکھنے میں ہماری ایک اداکارہ سے ملتی جلتی ہیں جنہیں ایک صحافی نے موصوفہ کہا تو ناراض ہو گئیں کہ اس نے ہمیں منہ صوفہ کہا۔

بہرحال اس انٹرویو میں مس سینڈی نے کہا ہے کہ مجھے ہزاروں نوجوانوں کے والدین نے شادی کی درخواستیں دی ہیں۔ میں آئندہ ماہ ایک تقریب میں سب کو مدعو کروں گی جہاں جو زیادہ دیر تک مسکرائے گا اس سے شادی کر لوں گی۔

بی بی سی کی اس بی بی کی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ آخر ہزاروں نوجوانوں کے والدین نے ہی موصوفہ کو شادی کی درخواستیں کیوں دیں' نوجوانوں نے کوشش کیوں نہیں کی۔ ہو سکتا ہے محترمہ نے مسکراہٹ کی یہ شرط رکھی ہی اس لیے ہو کہ شادی شدہ اور والدین قسم کے لوگوں کی چھانٹی ہو سکے' کیونکہ شادی شدہ کو اتنا مسکرانے کی عادت نہیں ہوتی۔ شادی کے بعد تو یہ حال ہوتا ہے کہ کسی نے ایک شخص سے پوچھا "آپ شادی شدہ ہیں!" تو اس نے کہا "نہیں دراصل میری ابھی ابھی کار چوری ہوئی ہے اس لیے آپ کو لگ رہا ہو گا۔" لوئیس سفیان بڑے مزے کی بات لکھتا ہے "خاوند اور بیوی خوشیوں بھری زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک دن ان کی اچانک ملاقات ہو گئی۔" مس سینڈی کا تعلق فرانس سے ہے۔ اگرچہ خواتین کے نام کے ساتھ مس

دراصل ضرورت رشتہ کا اشتہار ہی ہوتا ہے' مگر اس کے باوجود ایک صحافی نے مس سینڈی کا مس ان کے نام کا حصہ سمجھ کر پوچھا "آپ شادی شدہ ہیں؟" تو اس نے کہا "نہیں' آج کل تو نہیں۔"

ایک فرانسیسی نے کہا تھا ہماری عورتیں بناؤ سنگھار پر جتنا خرچ کرتی ہیں اتنا تو ہماری فوج کا بجٹ نہیں' تو فرانسیسی عورت نے کہا "جتنے کارنامے ہمارے مشہور ہیں اتنے فوج کے تو نہیں۔" نازک اندام فرانسیسی عورتیں چہرے کی جھریوں سے نہیں گھبراتیں' بشرطیکہ وہ ان کے اپنے چہرے پر نہ ہوں۔ مس سینڈی کی سب سے بڑی خوبصورت چیز اس کی آواز ہے جس میں اس قدر سوز ہے کہ جب وہ گاتی ہے تو چلتے لوگ رک جاتے ہیں تاکہ اسے چپ کرا سکیں۔ ایک فرانسیسی سیاست دان نے کہا تھا کہ میرے نزدیک آئیڈیل عورت وہ ہوتی ہے جو اتنی خوبصورت ہو کہ میں اس سے شادی کے لیے تیار ہو جاؤں اور وہ اس قدر کم عقل ہو کہ وہ مجھ سے شادی کے لیے رضا مند ہو جائے۔ یوں اس لحاظ سے سینڈی آئیڈیل نہیں' اگرچہ ہمارے نزدیک آئیڈیل وہی ہے جو ہمارے نزدیک ہے۔ ویسے بھی فنکار کا حسن اس میں نہیں اس کے فن میں ہوتا ہے۔ بہرحال سینڈی روایتی فرانسیسی عورتوں کی طرح زن مرید خاوند چاہتی ہے۔ اس لیے اس نے اس کے انتخاب کے لیے مسکراتے رہنے کی شرط رکھی۔

آج تک جتنی بھی شادیاں ہوئی ہیں کسی نہ کسی شرط پر ہوئی ہیں۔ ایک خاتون نے تو اپنے عاشق کو کہا تھا میں صرف اس شرط پر شادی کروں گی کہ وعدہ کرو تم ہمیشہ غیر شادی شدہ رہو گے' لیکن مس سینڈی والی شرط تو قصے کہانیوں میں بھی کسی نے نہیں رکھی' البتہ شادی کے بعد کی بات اور ہے۔ مس سینڈی نے شادی کے لیے مسکراتے رہنے کی صلاحیت لازمی قرار دے دی ہے ورنہ شادی تو وہ کام ہے جس کے لیے کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں۔ ایک وکیل سے کسی نے پوچھا "جنون" کی وجہ سے طلاق ہو سکتی ہے؟ تو اس نے کہا اس کا تو پکا پتہ نہیں' البتہ اتنا پتا ہے کہ اس کی وجہ

سے شادی ہو سکتی ہے۔ اس سے قبل سر عام مرد ہی عورت کا انتخاب کرتے مگر اب عورتیں بھی اس طرح خاوند چننے لگی ہیں' لیکن وہ اس پر بھی خوش نہیں۔ کسی نے ایک خاتون سے پوچھا کہ آپ کو کیسا خاوند چاہیے؟ تو اس نے ناراض ہو کر کہا آخر تم کیوں چاہتے ہو میں کسی کنوارے کے بجائے کسی خاوند سے شادی کروں۔ کہتے ہیں دنیا میں سب سے نالائق اور بے وقوف شخص صرف ایک ہوتا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر بیوی کے پاس ہوتا ہے۔ بہرحال ہر خاوند میں ایک خوبی ایسی ہوتی ہے جو دنیا کے کسی اور مرد میں نہیں ہوتی۔ ایک افریقی لڑکی نے اخبار کو اسی خوبی کا بتاتے ہوئے کہا "میرے منگیتر میں وہ خوبی ہے جو دنیا کے کسی اور مرد میں نہیں" پوچھا وہ کیا خوبی ہے؟ بولی "وہ یہ ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

گلوکارہ ہونے کے ناطے مس سینڈی کو مسکراہٹوں کا مقابلہ کرانے کے بجائے گلوکاری کا مقابلہ کرانا چاہیے تھا' لیکن یہ شاید اس لیے نہیں کرایا گیا کہ اس مقابلے میں صرف ایک زبان کے لوگ آتے۔ وہ نہ آ سکتے جن کی زبان سینڈی نہیں جانتی۔ سو اس نے مسکراہٹ کو چنا' کیونکہ یہ وہ زبان ہے جو ہر ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ وہاں پاکستان کی نمائندگی کے لیے فلسٹار رنگیلے کو بھیجا جائے' جو یقیناً یہ مقابلہ جیت لیں گے' کیونکہ ان سے طویل مسکراہٹ کس کی ہو سکتی ہے؟ وہ تو مسکرا رہے ہوں تو لگتا ہے پورا محلہ مسکرا رہا ہے۔ اتنی وسیع و حریص مسکراہٹ اور کہاں ملے گی لیکن رنگیلا صاحب شادیوں کے معاملے میں محمد شاہ رنگیلا ہیں۔ سو یہ ڈر ہے کہ وہ مسکرانے کے بجائے مس سینڈی کو دیکھ کر سنجیدہ نہ ہو جائیں۔

○○○

• استاد بڑے صدام حسین خان

ہمیں تو اب پتا چلا ہے کہ صدام حسین "بڑے استاد" ہی نہیں استاد بڑے صدام حسین خان صاحب بھی ہیں اور امریکہ پر ان کے بہت سے احسانوں میں ایک احسان امریکی موسیقی پر بھی ہے۔ یہ بات امریکیوں نے آج تک شاید اس لیے چھپائے رکھی کہ کہیں صدام حسین رائلٹی نہ مانگ لیں۔ یہ تو اتفاقاً موسیقی کی ایک تقریب میں صدر بش کے منہ سے نکل گیا کہ مجھے موسیقی سے بس اتنا ہی لگاؤ ہے کہ جب صدام حسین کا کوئی بیان پڑھ کر طبیعت خراب ہوتی ہے تو موسیقی سے دل بہلاتا ہوں۔ جس سے یہ پتا چلا کہ صدام نے موسیقی کو فروغ دینے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے' لگتا ہے جونہی صدام حسین کا امریکہ کے بارے میں کوئی بیان چھپتا ہو گا' امریکی اپنے صدر سمیت کیسٹیں خریدنے کے لیے میوزک سنٹروں کی طرف بھاگ اٹھتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے گلوکار باقاعدہ انتظار کرتے ہوں کہ صدام حسین کا بیان آئے اور وہ اپنی کیسٹیں ریلیز کریں تاکہ وہ ہاتھوں ہاتھ بک سکیں۔

جیسے ہمارے ہاں قیمت کی جمع قیامت ہوتی ہے' ایسے ہی صدام امریکیوں کے لیے صدمے کی جمع ہیں۔ مسلم ممالک کو تو صدام حسین کا صرف یہی فائدہ ہوا ہے کہ لوگوں کو اپنے بچوں کا نام رکھنے کے معاملے میں پریشان نہیں ہونا پڑتا۔ ہمارے ایک دوست نے بھی اپنے بیٹے کا نام صدام حسین رکھ دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد اس نے بدل کر خدام حسین رکھ دیا۔ کسی نے مشہور فاسٹ باؤلر للی سے پوچھا' آپ کی پسندیدہ موسیقی؟ تو اس نے کہا "میری بال مخالف بیٹسمین کے سر سے ٹکرانے کی آواز۔" ایسے ہی صدام حسین کی پسندیدہ موسیقی امریکیوں کے چلانے کی آواز ہے۔ ویسے بھی امریکی موسیقی ایسی ہے کہ ایک شخص نے امریکی گلوکار کو گاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا:

"آپ گاتے کیوں ہیں؟"

"تا کہ چلا سکوں۔"

"آپ چلاتے کیوں ہیں؟"

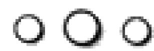
"کیونکہ میں گا نہیں سکتا۔"

بہرحال اب پتا چلا ہے کہ امریکی موسیقی میں گانا کم اور چلانا زیادہ کیوں ہے۔ ہمارے گلوکار پکا راگ گاتے وقت جیسا منہ بناتے ہیں ایسا تو امریکیوں کا صدام کا نام سن کر ہی ہو جاتا ہے۔ ویسے امریکی موسیقی سنتے وقت کسی دوسرے کی بات نہیں سنتے' جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ موسیقی کی آواز اس قدر بلند ہوتی ہے کہ دوسرے کی آواز ان تک پہنچتی ہی نہیں۔ میرے پاس کوئی امریکی بیٹھا ہو تو میں شور کے خلاف کوئی بات نہیں کرتا' کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں ان کے میوزک پر تنقید کر رہا ہوں۔

موسیقی روح کی غذا ہے۔ اسی لیے امریکی گلوکار گا رہے ہوں تو لگتا ہے کہ کھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ صدام حسین فوجی آدمی ہے' جس دن کسی فوجی کو نہ دیکھنا چاہے اس روز شیشہ نہیں دیکھتا۔ فوجیوں کو بھی موسیقی سے بڑا لگاؤ ہوتا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ دوسرے لوگ ہاتھ اور منہ سے موسیقی پیدا کرتے ہیں فوجی پاؤں سے پیدا کرتے ہیں۔ ان کی پریڈ موسیقی میں شامل ہے' اسی لیے تو ہٹ موسیقی کو ہٹ پریڈ کہتے ہیں۔

پہلے ایسے گلوکار ہوتے تھے جو راگ چھیڑتے تو جنگل میں آگ لگ جاتی۔ اب تو ایسے ہیں کہ راگ سے آگ اب بھی لگتی ہے مگر سننے والوں کو' لیکن استاد بڑے صدام حسین خان صاحب نے ایسا راگ چھیڑا کہ ریت میں آگ لگا دی۔ پانی تیل کی طرح جلنے لگا اور تیل پانی کی طرح بہنے لگا۔ اسی لیے انہی دنوں استاد روشنی خان صاحب نے اخباری بیان دیا تھا کہ خلیج کی لڑائی راگوں کو بے وقت گانے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ہمیں یہ اس لیے بھی ٹھیک لگا کہ ہم نے خود اپنے محلے میں راگوں کو بے وقت گانے پر کئی لڑائیاں ہوتے دیکھی ہیں۔ یہی نہیں استاد روشنی خان نے تو یہاں تک کہہ دیا

تھا کہ مجھے موقع دیا جائے تو میں ایسا راگ چھیڑوں گا کہ جنگ بند ہو جائے گی' یعنی عراق کویت کو خالی کر دے گا۔ امریکہ کویت کو خود "خالی" کرنے کے چکروں میں تھا ورنہ استاد روشنی کو کویت بلا لیتا اور وہ استاد بڑے صدام حسین خان صاحب کا ایسا توڑ کرتے کہ جہاں جہاں استاد روشنی خان کی آواز جاتی کویت خالی ہونے لگتا۔ استاد روشنی خان کو ایک بار کسی نے اپنے گھر محفل موسیقی پر بلایا۔ استاد نے پوچھا کیا سناؤں؟ تو اہل خانہ نے کہا استاد جو مرضی سنائیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں تو ساتھ والا مکان ہی خالی کروانا ہے۔ ایک ایسے استاد کے والد نے بتایا کہ بیٹے کے گانے سے مجھے بڑا مالی فائدہ ہوا۔ دوسرے نے کہا مگر اس نے تو کبھی گھر سے باہر نہیں گایا تو والد نے کہا۔ "اسی لیے مجھے ساتھ والا مکان آدھی قیمت پر مل گیا ہے۔" بہرحال استاد روشنی خان نے راگ گانا شروع کیا اور اس وقت تک گاتے رہے جب تک خلیج کی جنگ بند نہ ہو گئی اور جب انہوں نے گانا بند کیا تو ان کے محلے داروں کو واقعی یقین آ گیا کہ جنگ بند ہو گئی ہے۔ یوں خلیج کی جنگ دراصل مقابلہ موسیقی تھا جس میں عراقی ہار گئے اور استاد بڑے صدام حسین خان صاحب جیت گئے۔ آج کل سنا ہے وہ پھر کوئی نیا راگ چھیڑنے کی کوشش میں ہیں' اس لیے استاد روشنی خان کو تیار ہو جانا چاہیے۔



• SEL- FISH

خبر ملی ہے کہ خلیج کی جنگ کے بعد سے کویت میں مرد کم اور عوتیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ صاحب ہمیں تو اسی دن اس بات کا پتہ چل گیا تھا کہ کویت میں مرد کم ہیں۔ جب عراق نے کویت پر قبضہ کیا تھا اور جہاں تک عورتوں کے زیادہ نظر آنے کی بات ہے تو ساری دنیا میں یہی حال ہے کہ دیکھنے والوں کو جتنی زیادہ ایک اکیلی عورت نظر آتی ہے کئی مرد مل کر اتنے نظر نہیں آتے۔ پھر جنگ میں عورتیں بھی کام آئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک کویتی جنگ میں ہلاک ہونے والی اپنی بیوی کی قبر پر زار و قطار رو رہا تھا تو کسی نے کہا: "اس طرح رونے سے وہ واپس تو نہیں آ جائے گی؟" تو کویتی نے کہا "اسی لیے رو رہا ہوں۔" لیکن حکومت کویت نے عورتوں کو کم کرنے کے لیے سرکاری اعلان کیا ہے کہ کویتی فوراً دوسری شادی کریں اور جو یہ کرے گا اسے تین ہزار ڈالر انعام دیا جائے گا۔ یہ دنیا میں پہلی بار ہے کہ شادی کرنے کی بہادری کا مظاہرہ کرنے والے کے لیے حوصلہ افزائی کے انعام کا اعلان کیا گیا ہے۔ ویسے بھی دوسری شادی کرنا بچوں کا کھیل نہیں' بڑوں کا ہے۔ ہم نے بڑے بڑوں کو دیکھا ہے مگر کوئی بھی ایک سے زیادہ بار دوسری شادی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

نوجوان شاعر عباس تابش راتوں کو سڑک پر پھرتا رہتا۔ ایک بار ایک صحافی نے پوچھا اتنی رات گئے گھر جاتے ہو بیوی کچھ نہیں کہتی؟" کہا "نہیں۔" پوچھا "کیوں؟" بولا "اس لیے کہ میری ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔" تو صحافی بولا "پھر تم رات کو اتنی دیر تک گھر سے باہر کیوں رہتے ہو؟" اگرچہ شادیوں کی فی ایکڑ پیداوار ہالی وڈ میں سب سے زیادہ ہے۔ لیکن بیک وقت عرب جتنی بیویاں رکھتے ہیں اتنے تو ہمارے گھروں میں بچے نہیں ہوتے۔ عرب شیخ تو جب دفتر سے باہر جاتے ہیں ملازم کو یہ کہہ کر جاتے ہیں کہ ہماری غیر موجودگی میں بیوی کا فون آئے تو اس کا نام پوچھ کر لکھ لینا۔ سنگاپور

میں یہ حکومتی شرط ہے کہ جتنے بچے پیدا کرو اتنے درخت لگاؤ اور وہاں جس گھر میں دور سے درختوں کے جھنڈ لہراتے ہوئے نظر آئیں' سمجھ لیں کسی عرب شیخ کا گھر ہے۔

کویت میں اب یہ کام قوم کی خدمت کے زمرے میں آ گیا ہے۔ سو سنا ہے قومی خدمت کے جذبے سے سرشار وہاں کے کنوارے بھی دوسری شادی پر تیار ہو گئے ہیں۔ کچھ یہ بھی پوچھ رہے ہیں کہ صرف ایک ہی بار دوسری شادی کرنے پر تین ہزار ڈالر ملیں گے یا ہر بار دوسری شادی کرنے پر۔ بہر حال لگتا ہے کہ وہ دن دور نہیں جب مس کویت بھی کوئی مسز ہو گی۔ کیونکہ کویتی اپنے سلطان جابر الصباح سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ ایک اخبار میں یہ پڑھ کر کہ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے' کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں ہمارے کویتی کلاس فیلو بہت ناراض ہو گئے کہ آپ اپنے سلطان کے سامنے کلمہ حق کہیں ہمارے سلطان کا نام بیچ میں کیوں لاتے ہیں؟

ویسے صاحب ہم تو یہ جانتے ہیں جو بیوی اپنے خاوند سے لڑائی نہ کرے یقین کر لیں وہ اسے خاوند سمجھتی ہی نہیں؟ پھر جہاں کمان کرنے کے لیے دو دو سائیں ہوں وہاں لڑائی کیسے نہ ہو؟ کون سی بیوی ہے جس نے لڑ کر یہ نہ کہا ہو کہ میں اپنی ماں کے ہاں چلی جاؤں گی۔ کبھی یہ وعدہ ہوتا ہے اور کبھی دھمکی۔ آپ پوچھیں گے دونوں میں کیا فرق ہے؟ تو صاحب اگر وہ ماں کے پاس چلی جائے تو وعدہ اور اگر یہ کہے کہ میں ماں کے پاس جا کر اسے یہاں لا رہی ہوں تو دھمکی۔ بہرحال ہمیں تو لگتا ہے عراق کویت جنگ کے بعد حکومت کویتیوں کو لڑائی کی ٹریننگ دینا چاہتی ہے اور یہ ٹریننگ یونٹ گھر گھر کھولنا چاہتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے سلطان جنگ میں بزدلی دکھانے پر کویتیوں کو سزا دینا چاہتے ہوں۔ ان کے پاس جیل تو اتنی بڑی ہے نہیں کہ انہیں قید کی سزا دیں' سو وہ انہیں ان ہی کے گھروں میں عمر قید کرنا چاہ رہے ہوں وہ بھی دوہری ہتھکڑی سے۔ لیکن ہمیں تو یہ سزا عورت کو دی گئی لگتی ہے کیونکہ کسی شاعر کو سزا دینا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی مشاعرے پر بلواؤ اور نہ پڑھواؤ۔ عورت کو سزا دینا ہو

تو اس کے خاوند کی شادی کرا دو۔ یہ بھی ممکن ہے جنگ کے دوران غیر تسلی بخش کارکردگی پر حکومت کویت اخباروں کو سبق سکھانا چاہتی ہو کیونکہ کویت اتنا چھوٹا ملک ہے کہ ایک کویتی نے کہا میں پہلے روزانہ اخبار خریدتا تھا کہ نت نئی خبریں ملتی رہیں لیکن اب مجھے ایسی خبروں کے لیے اخبار کی ضرورت نہیں رہی' میں نے شادی کر لی ہے۔ کویت کے "چھوٹا" ہونے کی وجہ سے ایک بار ایک شیخ صاحب کو اپنی دلہن دیکھ کر یہ کہنا پڑا آپ بڑی جانی پہچانی لگتی ہیں۔ کیا واقعی آپ کی مجھ سے پہلے شادی نہیں ہوئی؟ ڈچ کہاوت ہے' پہلی شادی ڈیوٹی' دوسری حماقت اور تیسری پاگل پن ہے۔ سو کویت میں یہ حماقت جب سے ڈیوٹی قرار پائی ہے شیخ صاحبان اس قومی فریضے سے بخوبی عہدہ برا ہونے کے لیے دن رات ایک کر رہے ہیں۔ سنا ہے انہوں نے خوراک پر بھی خصوصی توجہ دینا شروع کر دی ہے۔ ہم نے پوچھا کیا وہ گھی مکھن کھا رہے ہیں؟ پتہ چلا نہیں وہ فش پسند فرما رہے ہیں کیونکہ ایسے کاموں کے لیے فش ضروری ہوتی ہے۔ ہم نے پوچھا: "کونسی فش؟" جواب ملا "SEL-FISH"

○○○

• اپیل برائے تبدیلی نام

صحافیوں نے جب پہلے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ امریکہ میں بھارت کے سفیر عابد حسین ہیں اور ہماری سفیر کا نام عابدہ حسین ہے سو ملتے جلتے ناموں کی وجہ سے پیغام اور ڈاک ادھر ادھر ہو جایا کرے گی اور ہو سکتا ہے پاکستانی سفیر کو یہ پیغام ملے کہ "ابو آپ کے لیے شیو کا سامان بھجوا دیا ہے" اور بھارتی سفیر کو ایسا کہ "امی آپ کے دوپٹے نوکروں کو دے دیئے ہیں۔ آپ کے کس کام کے!" ہم نے کہا تھا کہ دونوں میں فرق کرنا اتنا مشکل نہ ہو گا کیونکہ ایک مرد ہے اور "دوسرا خواتین۔" تو جواب ملا یہی جاننا مسئلہ ہے کہ مرد کون ہے؟ سو یہی غلطی اخبار والوں کو لگی جنہوں نے بیان میں مردانگی دیکھ کر سمجھ لیا یہ بیگم عابدہ حسین کا ہے اور ان کے نام سے چھاپ دیا کہ ہمیں اسرائیل کو تسلیم کر لینا چاہیے' حالانکہ بیگم صاحبہ کسی کو تسلیم کر لیں' ہو ہی نہیں سکتا یقین نہ آئے تو فخر امام صاحب سے پوچھ لیں۔

صاحب یہودی ایسی قوم ہے کہ ہم نے غصے میں بھی یہودیوں کو کبھی گالی نہیں دی ہمیشہ ایسے موقعوں پر انہیں "یہودی" ہی کہا۔ جرمن سکول میں اکلوتے یہودی لڑکے کو ڈانٹتے ہوئے ایک جرمن استاد نے کہا تھا "تم بھی اپنی ہم نسلوں کی طرح لالچی' خود غرض اور دوسروں کی حق تلفی کرنے والے ہو۔ تمہارا باپ تمہاری پڑھائی کے لیے فیس تو ایک طالب علم کی ادا کرتا ہے جبکہ تم پڑھتے تین طالب علموں جتنا ہو۔" کہاوت ہے کہ جہاں دو یہودی ہوں وہاں تین آرا ہوتی ہیں۔ وہ اس قدر خود غرض ہوتے ہیں کہ بچپن میں اسحاق شمیر کا بٹوہ گم ہو گیا جو اس کے بھائی کو مل گیا۔ تب سے بھائی گم ہے۔ عربوں کی بے وقوفی سے وہ عرب اسرائیل جنگ جیت گئے۔ اس جنگ میں ناصر نے اپنے چیف آف آرمی سٹاف سے کہا' جنگ میں وہی حکمت عملی اختیار کرو جو روس

کے مارشل کیوتوف نے نپولین کو شکست دینے کے لیے اختیار کی۔ عرب فوجی افسروں نے وہی کیا یعنی دشمنوں کو اپنے علاقے میں کھینچ لائے اور برف باری ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ موشے دایان عربوں' اسرائیلیوں اور ہمیں ایک ہی آنکھ سے دیکھتا مگر وہ ہمیں ایک آنکھ نہ بھاتا۔ ہم نے تو ایک بار اس کی تصویر کو "نظر وٹو" قرار دیا تو ہمارے دوست منظور وٹو صاحب نے اس پر احتجاج کیا۔ اگرچہ ہمارے سیاست دانوں کا پسندیدہ فقرہ یہی ہے۔ "قبول ہے...... قبول ہے......" مگر اسرائیل کو تو وہ سسرائیل قبول کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ سو یہ بیان بھارتی سفیر کا ہی ہو سکتا ہے۔ موصوف دیکھنے میں بھی غیر حاضر دماغ پروفیسر لگتے ہیں۔ سنا ہے ایک بار سوئمنگ پول میں گر گئے۔ عملے نے بمشکل نکالا تو کہنے لگے یہ مشکل میرے حافظے کی وجہ سے پیش آئی' مجھے یاد ہی نہ رہا کہ مجھے تو تیرنا بھی آتا ہے۔ یہی غیر حاضر دماغی یہودیوں کی خوبی ہے۔ اسرائیل میں غیر حاضر دماغ پروفیسروں کا الگ سے کوٹہ ہوتا ہے۔ ایک بار اسرائیل وزیراعظم دفتر سے نکلے تو آگے سے ان کا بیٹا مل گیا۔ اس نے سلام کیا تو اسرائیلی وزیراعظم نے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا سناؤ تمہارے والد کا کیا حال ہے؟ سو یہ دماغی ہم آہنگی بھی اس حق میں جاتی ہے کہ یہ بیان عابد حسین کا ہے۔ پھر وہ بیوروکریٹ ہیں۔ کیکڑے اور بیوروکریٹ میں یہ قدر مشترک ہے کہ یہ نظر آتا ہے کہ دونوں چل رہے ہیں۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ پاس آ رہے ہیں یا دور جا رہے ہیں۔ بیگم عابدہ حسین صاحبہ سیاست دان ہیں اور سیاست دان کے تو گھر میں بھی آگ لگ جائے تو وہ فائر بریگیڈ کی بجائے اخبار کے دفتر فون کرتا ہے۔ وہ جب پاکستان میں تھیں تو ان کو تین کالمی سرخی پر ٹرخا دیا جاتا جبکہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی سرخی آٹھ کالمی ہوتی جس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ بیگم عابدہ حسین کو زیادہ میک اپ کرنا پسند نہیں۔ بہرحال جب سے وہ امریکہ گئی ہیں وہ اتنا گھر میں نہیں رہتیں جتنا خبروں میں رہتی ہیں۔ گول مول بات بھی نہیں کرتیں حالانکہ خود دیکھنے میں ایسی ہیں کہ فخر امام صاحب انہیں اپنی "دنیا" کہتے ہیں۔

پھر وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتی ہیں۔ شاید اسی لیے اخباروں نے عابد حسین کا بیان عابدہ حسین کے نام سے چھاپ دیا۔

بیگم صاحبہ نے جب چادر کے بارے میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ موٹاپے اور سفید بالوں کو چھپاتی ہے' تو ہم نے سوچا چلو چادر کی وجہ سے پتہ چل جائے گا کہ بیگم صاحبہ کونسی ہیں؟ مگر بھارتی عابد حسین نے چادر لینا بند ہی کر دی۔ اب دونوں میں صرف بالوں کا فرق ہے کہ عابد حسین کے بال ذرا لمبے ہیں۔ امریکیوں سے پوچھا جائے تو وہ یہی کہتے ہیں ہمارے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکی تو نام کا آخری حصہ بلاتے ہیں گویا ان کے لیے یہ دونوں حسین ہیں۔ لیکن ہم لوگ تو بولتے ہوئے لفظ کا آخری حرف اکثر کھا جاتے ہیں جس وجہ سے ہمارا دوست "چوہان" اکثر لڑنے پر اتر آتا ہے۔ سو ہمیں تو بڑا فرق پڑتا ہے۔ آج کل لوگ امریکہ کو اتنی اہمیت دینے لگے ہیں کہ ان کے نزدیک جو امریکہ میں نہیں مرا وہ زندہ ہی نہیں رہا۔ سو ہم یہ تو نہیں کہتے کہ بیگم صاحبہ کو وہاں سے بلا لیا جائے۔ ہاں یہ اپیل ہے کہ وہ اپنا نام تبدیل کر کے کچھ مدت کے لیے بیگم فخر امام بن جائیں تاکہ ہمیں دوبارہ ایسے بیان پڑھنے نہ پڑیں۔ یاد رہے یہاں بیگم فخر امام سے مراد یہ نہیں کہ ہم فخر امام صاحب کو بیگم بننے کے لیے کہہ رہے ہیں۔



• DIE-VORCE

جب بھی کسی خوبصورت خاتون کو طلاق ہوتی ہے تو ہمارے ہاں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے' لیکن سچ پوچھیں تو سارہ فرگوسن کی طلاق پر ہمیں بہت دکھ ہو رہا ہے لیکن کیا کریں جس خاتون کی طلاق پر ہم رنجیدہ ہو جائیں لوگ اسے بدصورت سمجھنے لگتے ہیں۔ سارہ فرگوسن تو ہماری پنجابی مٹیار کی طرح ہے۔ دیکھنے والے یہ نہیں پوچھتے یہ سارہ فرگوسن ہے؟ یہ پوچھتے ہیں: "یہ ساری فرگوسن ہے؟" شادی سے پہلے فرگوسن نے اپنی قریبی سہیلی سے کہا کہ میں تو اپنے جیسے مرد سے شادی کروں گی۔ تو سہیلی نے کہا: "آپ بالکل پریشان نہ ہوں بدلباس' منہ پھٹ اور ست مردوں کی دنیا میں کمی تو نہیں۔"

کسی نے کہا تھا ایک وقت آئے گا جب دنیا میں صرف پانچ بادشاہ رہ جائیں گے' چار تاش کے اور ایک برطانیہ کا۔ لیکن یہ غلط ثابت ہوا۔ البتہ اب یہ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں صرف پانچ ملکائیں ہیں چار تاش کی اور ایک برطانیہ کی۔ ایک زمانہ تھا سلطنت برطانیہ میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ جس کی وجہ ڈنگن سیانیتہ نے یہ بتائی کہ خدا اندھیرے میں انگریزوں پر بھروسہ نہیں کرتا۔ بہرحال جب سے سورج غروب ہوا ہے' شاہی خاندان نت نئے چاند چڑھانے لگا ہے؟ اب تو شاہی محل کی خبریں پڑھ کر وہ شاہی محل کم اور شاہی محلہ زیادہ لگنے لگا ہے حالانکہ آج بھی وہاں پیدا ہونے والے بچے کو بولنا بعد میں سکھاتے ہیں آداب و اطوار پہلے سکھائے جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو لڑکا لڑکی ایک دوسرے کو پسند کریں تو ان کو سختی سے روک دیا جاتا ہے۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کریں تو شادی کرا دی جاتی ہے۔ لڑکے لڑکی کی رائے صرف اس وقت اہم ہوتی ہے' جب طلاق کا معاملہ ہو۔ سارہ فرگوسن نے آٹھ سال قبل شہزادہ اینڈریو سے مرضی سے شادی کی' جی ہاں ملکہ کی مرضی سے۔ کسی نے نجومی سے پوچھا تھا کہ سٹیوواٹ اور اینڈریو میں کون خوش قسمت ایسا ہو گا جس کی سارہ فرگوسن سے شادی ہو

گی' تو نجومی نے کہا اینڈریو سے شادی ہو گی اور سٹیواٹ خوش قسمت ہو گا۔ دونوں میاں بیوی کے ایک سال بعد ہی ایسے تعلقات ہو گئے کہ ایک بیمہ کمپنی نے کہا ہم بحری

جہاز یا دوسری اشیاء جو ہمارے ہاں بیمہ شدہ ہوں ان کے پیسے نہیں دیتے بلکہ ویسی چیزیں لے کر دیتے ہیں تو اینڈریو نے کہا پھر میری بیوی کا بیمہ حیات منسوخ کر دیں۔

مغرب میں شادی کا فعل مستقبل' طلاق ہے۔ برطانیہ میں ایک بار طلاق کی شرح کم کرنے کے لیے تحریک چلائی گئی تو بمشکل 10 فیصد طلاق کی شرح کم ہو سکی جس کے لیے بھی شادی کی شرح 10 فیصد کم کرنا پڑی۔ کیلیفورنیا میں تو اتنی جلدی طلاق ہوتی ہے کہ وہاں شادی کی تصویریں پولا رائیڈ کیمرے سے بناتے ہیں۔ یہ عالم ہے کہ الزبتھ ٹیلر شاپنگ کے لیے گئی' اسے ایک مردانہ جوتا بہت پسند آیا لیکن جوتے کا نمبر 6 تھا جبکہ اس کے خاوند کے پاؤں کا نمبر 8 تھا مگر دکاندار نے کہا میڈم لے لیں پھر کام آ جائے گا۔ انگریز اس پر بھی فخر کرتے ہیں کہ یہاں طلاق لینا اتنا آسان ہے کہ آپ نے ہمارے ہاں کسی لڑکی کو شادی پر روتے نہ دیکھا ہو گا لیکن یہ ضرور ہے کہ مغرب میں طلاق دینے پر عورت کو بہت پیسے دینے پڑتے ہیں' جبکہ شادی کا کیا وہ تو دس پاؤنڈ میں بھی ہو جاتی ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ آزادی کے لیے ہمیشہ بڑی قیمت ہی دینا پڑتی ہے۔ لیکن شاہی محل تو وہ میوزیم ہے جہاں افراد نوادرات کی طرح شوکیسوں میں سجے ہوئے ہیں۔ شاہی خاندان کے افراد اپنڈکس کی طرح ہوتے ہیں۔ جب بے درد ہوں تو ان کے وجود کا احساس تک نہیں ہوتا لیکن جب زندہ ہونے کا احساس دلائیں تو انہیں نکالنے کا سوچا جانے لگتا ہے۔ یہی فرگوسن کے ساتھ ہوا۔ اس پر پہلے یہ الزام لگایا کہ اس کے ایک ڈرائیور کے ساتھ تعلقات ہیں' حالانکہ اس نے تردید کی کہ میرے ڈرائیور کے ساتھ تعلقات نہیں ہیں۔ ڈرائیور کے میرے ساتھ تعلقات ہیں۔ جہاں تک سٹیوواٹ کے ساتھ شہزادی کے تعلقات کی بات ہے تو ان کا معاشرہ ایسا ہے کہ شاہی خاندان کا ایک فرد اپنے لکھ پتی دوست کے ساتھ ایک محفل میں پریشان ہو کر کہنے لگا: غضب ہو گیا' وہ دیکھو میری بیوی اور میری گرل فرینڈ آپس میں باتیں کر رہی ہیں'

کہیں راز نہ کھل جائے۔" تو لکھ پتی دوست نے ادھر دیکھ کر کہا "مگر وہاں تو میری بیوی اور میری گرل فرینڈ باتیں کر رہی ہیں۔" سارہ فرگوسن محفل میں کسی سے ہاتھ بھی ملا لیتی تو شاہی ترجمان ہفتہ وضاحتیں کرتا رہتا۔ ایک بار شاہی ترجمان نے کہا "سارہ فرگوسن کی گفتگو سے صرف چار منٹ کی بات چیت نکال دی جائے تو باقی شاہی خاندان کے مطابق ہے۔" ایک صحافی نے کہا مگر سارہ نے تو صرف تین منٹ ہی گفتگو کی۔ تو شاہی ترجمان بولا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔" سارہ کے جاننے والے حیران ہیں کہ جب اس نے شاہی خاندان میں شادی کی تب اس کے ذہن میں پتہ نہیں کیا تھا؟ ویسے اس کے ذہن میں کچھ ہوتا تو شادی ہی کیوں کرتی۔ سنا ہے وہ دل کی گہرائیوں سے اینڈریو کو اور گیرائیوں سے سٹیوواٹ کو چاہتی ہے۔ اسی بارے میں جب اینڈریو سے پوچھا گیا تو اس نے خاموشی اختیار کی۔ ایسے موقع پر ہمارے ہاں خاوند تین منٹ خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ حالات سے لگتا ہے یہ طلاق پہلے ہو جاتی' لیکن اتنے سال بعد ہونے کی وجہ یہ تھی کہ سارہ اندر ہوتی تو اینڈریو باہر ہوتا۔ اینڈریو باہر ہوتا تو سارہ اندر ہوتی۔ یوں دونوں کی ملاقات نہ ہوتی۔ سو طلاق پر گفتگو ہی نہ ہو سکی۔ اب ہوئی ہے تو ہمیں سارہ فرگوسن کا محل سے جانا برمحل نہیں لگتا۔ وہ باہر کیا کرے گی؟ اگرچہ برطانیہ میں لڑکیاں بچپن ہی سے چھوٹے موٹے کام کرنے لگتی ہیں۔ ابھی وہ سکول گرلز ہی ہوتی ہے جب وہ منے منے سویٹر اور منی منی جرابیں بننے لگتی ہیں۔ پتہ نہیں کیوں ہمیں Divorce ہمیشہ Die Vorce لگتی ہے۔ لیکن جب ہمارے جیسے جذبات والے ایک صحافی نے سارہ فرگوسن سے کہا کہ مجھے آپ کو طلاق ہونے پر بڑا دکھ ہوا ہے۔ تو سارہ نے کہا: "ایک تو تم مردوں سے عورت کی خوشی برداشت ہی نہیں ہوتی۔"

ooo

• حلوے پر پابندی

اگرچہ حلوے پر پابندی تو ہمارے مولوی حضرات کے ہاں بھی ہے مگر یہ کھانے کی پابندی ہے لیکن صدام حسین نے عراق میں حلوہ کھانے پر پابندی لگا دی ہے۔ ہمیں یاد ہے بھٹو صاحب کو الٹانے میں حلوے نے بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔ سو ہو سکتا ہے صدام حسین نے اپنی حکومت بچانے کے لیے حلوے پر پابندی لگانے کا سوچا ہو۔ حلوہ کیا ہے؟ یہ وہ حل ہے جو پہلے "حل" بعد میں "وہ" ہوتا ہے۔ یہ چینی' سوجی اور گھی کو اس طرح ملانے سے وجود میں آتا ہے جیسے نوابزادہ نصراللہ خان صاحب پارٹیوں کو ملانے سے "اتحاد" بناتے ہیں۔ جس طرح تربوز وہ پھل ہے جسے بندہ کھا بھی سکتا ہے' پی بھی سکتا ہے۔ یہی نہیں اس سے ہاتھ منہ بھی دھو سکتا ہے۔ ایسے ہی حلوہ وہ مٹھائی ہے جو ہمارے ہاں کھانے اور تحریک چلانے کے کام آتی ہے۔ یہی نہیں بڑے بڑے گلے باز اس سے غرارے کرتے ہیں۔ غرارے ہمیں بھی بھلے لگتے ہیں' بشرطیکہ کپڑے کے ہوں۔ کہتے ہیں ملا کا پیٹ مرغوں کا مقبرہ ہوتا ہے لیکن صاحب ہم تو اتنا جانتے ہیں حلوے کی سب سے بڑی پلیٹ ملا اور پنڈت کا پیٹ ہوتا ہے۔ بہرحال ہمیں تو حلوے میں یہی خوبی نظر آتی ہے کہ یہ میٹھا ہوتا ہے اور میٹھا ہمیں اس قدر پسند ہے کہ ہمیں تو رنگ بھی میٹھا ہی پسند ہے لیکن جیسے ایک پرانی جیبی کک بک میں آملیٹ بنانے کی ترکیب یوں لکھی ہے "پہلے دو انڈے چرائیں...... " تو آج کل عراق میں چینی اتنی نایاب ہے کہ وہاں حلوہ پکانے کی یہی ترکیب ہے۔ وہاں چینی کی جو قسم آج کل ملتی ہے' وہ نکتہ چینی ہے۔ ویسے ہم چینی کو صرف کھانے والی چیز ہی سمجھتے ہیں لیکن ہمارے ایک دوست نے چینی سے شادی کر کے اس کے نئے استعمالات سے آگاہ کیا۔ ہو سکتا ہے صدام حسین نے حلوے پر اس لیے پابندی لگائی ہو کہ چینی نہ خریدیں۔ حالانکہ انہیں کون بتائے گا کہ لوگ کتاب' فلم اور مشروب بھی وہی ڈھونڈتے ہیں جس پر پابندی ہو۔

سو پابندی لگانے سے تو اس کی خرید و فروخت بڑھے گی۔

میٹھا کھانے سے مرد موٹے ہو جاتے ہیں۔ عورتیں اس لیے موٹی نہیں ہوتیں کہ وہ پہلے ہی موٹی ہوتی ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ جو عورت کبھی موٹی نہیں رہی' وہ کبھی عورت ہی نہیں رہی۔ عورتیں اس وقت کھاتی ہیں جب وہ بولتی ہیں اور مرد اس وقت بولتے ہیں جب وہ کھاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا عراق میں ہر طرف موٹاپا پھیلا ہوا تھا۔ پنڈتوں کے توحلوہ کھا کھا کے ہر ماہ کپڑے تنگ ہو جاتے اور یوں انہوں نے تنگ آ کر کپڑے پہننے ہی کم کر دیئے۔ ہو سکتا ہے کہ صدام حسین نے اہل عراق کو سمارٹ بنانے کے لیے حلوے پر پابندی لگائی ہو۔ ہم تو سمجھتے ہیں موٹاپے سے بچنے کے لیے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ مٹھائی کھاؤ جو میٹھی نہ ہو اور دوسرا یہ کہ اپنے پیسوں کی کھاؤ۔ خود بل دینے سے وزن بڑھتا نہیں کم ہوتا ہے۔ ویسے بھی عراق میں میٹھا اس قدر کم ہے کہ وہاں میٹھی باتیں تک سننے کو نہیں ملتیں۔ اگر کسی عراقی کو شوگر بھی ہو جائے تو امریکہ شور مچا دیتا ہے کہ عراق شوگر میں خود کفیل ہو گئے ہیں۔ صحت کے معاملے میں ان کی یہ حالت ہے کہ دو کرد ڈھانچے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "میں جنگ کے دنوں میں ایک کھائی میں بھوکا پیاسا رہنے کی وجہ سے مرا۔ تم کیسے مرے؟" تو دوسرا احتجاجی لہجے میں بولا "میں تو ابھی زندہ ہوں۔"

حلوے کو ہمارے ہاں بڑا نمک مرچ لگا کر پیش کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حلوہ تو وہ سویٹ ڈش ہے جسے مولوی چمچ سے نہیں کھاتے' شوق سے کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں ایک بار مولانا کوثر نیازی نے کسی سے پوچھا "حلوہ ہے؟" مگر حلوہ یوں حلق سے ادا کیا کہ سننے والے نے کہا "ہے تو سہی مگر اتنا نہیں۔" بہرحال ہم تو اس پابندی کو بھی حلوہ ہی سمجھتے ہیں مگر ڈر بھی ہے کیونکہ انسان کا کائنات میں پہلا گناہ کھانے سے متعلق ہی تھا۔ بہرحال یہ پتہ چلا ہے کہ یہ پابندی صرف تین سالوں کے لیے ہے۔ ہم نے پوچھا "اس کے بعد کیا ہو گا؟" کہا "اس کے بعد لوگ عادی ہو جائیں گے۔"

• وٹامن بی --- وی

امریکی سائنس دانوں نے کئی سال کی تحقیق کے بعد یہ اعلان کیا ہے کہ شادی کرنے سے دل کا دورہ نہیں پڑتا۔ اگرچہ یہ تو ہمیں بھی علم تھا کہ دل کا دورہ تب پڑتا ہے جب بندہ زیادہ سوچنے والا کام کرے۔ شادی پر کیسے پڑ سکتا ہے لیکن انہوں نے شادی کو دوا بنا کے پیش کیا ہے۔ شاید اسی لیے ان کے ہاں شادی بھی یوں ہی ہوتی ہے جیسے ہمارے ہاں دوا استعمال ہوتی ہے یعنی صبح' دوپہر' شام۔ ہمارے ہاں یادداشت کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ پاکستان کے پہلے وزیراعظم کا نام بتائیں؟ جبکہ امریکہ میں خواتین کی یادداشت کا امتحان یوں لیا جاتا ہے کہ آپ اپنے پہلے خاوند کا نام بتائیں؟ اور جو یہ نام نہ بتا سکے' اسے ذہنی طور پر تندرست مان لیا جاتا ہے۔ البتہ اگر بچی سات سال سے چھوٹی ہو تو اس سے پوچھتے ہیں' آپ اپنے والد کا نام بتائیں؟ امریکی رائٹر میری میک کارتھی کے بقول ہم بیس ملین غسل خانوں کی قوم ہیں اور ہر غسل خانے میں ایک صاحب درد ہے۔ شکر ہے انہوں نے ماحول کے مطابق اس صاحب درد کی دوائی ڈھونڈ لی۔

ویسے دیکھا جائے تو یہ کوئی نئی دریافت نہیں ہے۔ ہمارے ہاں برسوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔ بڑے بوڑھے اکثر لاعلاج نوجوانوں کی اسی طریقہ علاج سے درستی کرتے رہے ہیں۔ اردو ادب میں بھی دل کے درد کا علاج یہی تجویز ہوتا رہا ہے۔ صبح' دوپہر' شام محبوب۔ اب امریکیوں نے یہ سہرا صرف اپنے سر باندھنے کے لیے محبوبہ کی جگہ منکوحہ کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے محبوبہ کی جگہ منکوحہ کو درد دل کی دوائی اس لیے قرار دیا ہو کہ وہ دوائی ہی کیا جو کڑوی نہ ہو۔ بیوی دیکھنے میں کیپسول ہی کیوں نہ ہو مگر یہ لگتی گولی کی طرح ہی ہے۔ بیوی کی تو تجاویز اور تجاوزات سے دل تنگ ہی رہتا ہے۔ شاید اس لیے بلونت سنگھ نے لکھا ہے کہ بیوی تو خود بیماری ہے اور اس کا ایک

ہی علاج ہے' وہ یہ کہ اس کا علاج نہ کرایا جائے۔ ویسے اتنا تو ہمیں بھی پتا ہے کہ جو بیوی مہینے میں ایک بار بیمار نہ ہو' یقین کر لیں وہ تندرست نہیں ہے۔

سابق امریکی صدر روز ویلٹ نے کہا ہے کہ دل سخت ہونے سے بری چیز ایک ہی ہے اور وہ ہے دماغ کا نرم ہونا۔ شادی کے لیے یہ دونوں ضروری ہیں۔ امریکہ میں دل کے روگ سکول کے بچوں میں بڑھ رہے ہیں۔ اگرچہ وہاں علاج معالجے کی اتنی سہولتیں ہیں کہ بچیوں کے ہر سکول کے ساتھ میٹرنٹی ہوم کھولنے کا سوچا جا رہا ہے لیکن اس میں ہم ان سے پیچھے نہیں' وہاں سکول میں طلبہ باپ بن جاتے ہیں تو ہمارے طلبہ کالج آنے سے پہلے ہی "دادے" بن چکے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ سب امریکہ کی "خاوند بناؤ" مہم کا حصہ ہو کیونکہ جو بندہ غلط بات پر معافی مانگے' وہ عقلمند ہوتا ہے اور جو صحیح بات پر معافی مانگے' اسے خاوند کہتے ہیں اور امریکیوں کو خاوند سے اچھا کون لگے گا' شاید اسی لیے عرب ممالک میں تیس سال کی عمر تک عورتیں سو فیصد اور مرد چار سو فیصد تک شادی شدہ ہوتے ہیں البتہ امریکہ کی اپنی صورتحال یہ ہے کہ 30 سے 35 سال کی عمر تک 65 فیصد غیر شادی شدہ ہوتے ہیں جبکہ پندرہ سے بیس سال کی عمر میں صرف تیس فیصد غیر شادی شدہ ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں دل میں درد ہونا تو بڑی خوبی مانا جاتا ہے۔ ہمارے تو مشہور شعراء تک نے کہہ دیا ہے کہ:

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

ہو سکتا ہے آئندہ خود کو انسان ثابت کرنے کے لیے درد دل ہی نہیں ساتھ ای سی جی (ECG) رپورٹ بھی دکھانا پڑے۔ پہلے تو ہم محبوب کو اپنے دل میں رکھتے۔ اب تو اسے بھی الگ سے مکان لے کر دیتے ہیں۔ یوں ہمارے ہاں دل کا مسئلہ شروع سے ہی طبی مسائل کی بجائے عائلی مسائل میں سے ایک رہا ہے۔ مسرت نذیر کی ڈاکٹر ارشد سے شادی

کے چند سال بعد مسرت نذیر کو دل کی پھر تکلیف ہوئی۔ دوا لی' افاقہ نہ ہوا تو ساتھی اداکارہ نے کہا "بھئی ہم کو دوائی سے افاقہ نہ ہو تو ہم ڈاکٹر بدل لیتے ہیں۔ سو اگر تم کہو تو ڈاکٹر بدلنے کے لیے وکیل سے بات کروں۔" لیکن اس ریسرچ کے بعد تو لگتا ہے کہ دل کے مریضوں کو باقاعدہ مشوروں کے لیے ڈاکٹروں کی بجائے وکیلوں کے پاس جانا پڑے گا اور ڈاکٹروں کے نسخوں میں وٹامن کے ساتھ وٹامن بی...... وی بھی لکھی ملے گی اور ساتھ درج ہو گا' بچوں کی پہنچ میں رکھیں۔ علامات برقرار رہیں تو قریبی میرج سنٹر سے رابطہ کریں۔



- کورم ٹوٹنا

صاحب! ہمیں کورم' وضو اور ریکارڈ ٹوٹنا کبھی اچھا نہیں لگا۔ ہم تو حل لے کر ایسے مسئلے ڈھونڈتے ہیں۔ پچھلے دنوں پے در پے کورم ٹوٹنے پر ہم نے سوچا' اسے ٹوٹنے سے بچانا چاہیے' نتیجہ کچھ بھی ہو۔ جیسے مولانا فضل الرحمٰن صاحب پارٹی اور پیٹ کو کنٹرول کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ انہوں نے وزن کم کرنے کے لیے ایک ماہ صبح شام دوڑ لگائی تو کسی نے پوچھا: "کتنا وزن کم ہوا؟" کہا "دو انچ" پوچھا کہاں سے؟" بتایا" چپل کے تلاؤں کے نیچے سے۔" ہمارے ساتھ بھی ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ جو سوچتے ہیں' وہ چوری ہو جاتا ہے حالانکہ ہم چوری چوری سوچتے ہیں۔ ہم نے شاعری شروع کی' ابھی آٹھ دس غزلیں ہی لکھی تھیں کہ پتہ چلا میر تقی میر نامی کسی شاعر نے' وہ اپنے دیوان میں کئی برس پہلے چھاپ بھی دیں۔ ایسے ہی کورم ٹوٹنے سے بچانے کے لیے ہم حفاظتی تدابیر سوچ ہی رہے تھے کہ پنجاب اسمبلی کے سپیکر منظور وٹو صاحب نے اس پر مضمون لکھا دیا۔ اگرچہ ان کے مضمون کا ہمیں آخری حصہ ہی اچھا لگا۔ آپ پوچھیں گے' آخری حصے میں کیا خوبی تھی؟ تو صاحب! اس سے بڑی خوبی اور کیا ہو گی کہ وہ آخری حصہ تھا۔ ہم سمجھتے تھے' کورم رش کی وجہ سے ٹوٹ جاتا ہے' لیکن منظور صاحب نے بتایا کہ یہ اس وقت ٹوٹتا ہے جب ارکان اسمبلی 1/4 سے کم ہوں۔ کہتے ہیں' شادی وہ رشتہ ہے جس میں 1/2 اور 1/2 مل کر 1/4 بنتے ہیں اور اگر یہ اس سے کم ہوں تو گھر کا کورم پورا نہیں ہوتا اور کارروائی رک جاتی ہے۔

منظور وٹو صاحب بہت تیز آدمی ہیں۔ وہ تو چور کے پیچھے بھاگیں تو اگلے ہی لمحے وہ ان کے پیچھے ہوتا ہے۔ اپنے حلقے کے اتنے منظور نظر ہیں کہ لوگ شادی پر بھی اب یہ نہیں پوچھتے "قبول ہے یا نہیں؟" پوچھتے ہیں "منظور ہے یا نہیں!" ہمارا خیال تھا کہ وہ کہیں گے اسمبلی میں رجسٹر حاضری ہونا چاہیے' ہر رکن کی "رول کال" ہو' جو نہ آ

سکے وہ چھٹی کی درخواست بھیجے اور جو بغیر اطلاع کے غیر حاضر ہو' اسے اگلی بار بینچ پر کھڑا کر کے پچھلے اجلاس کی کارروائی "منہ زبانی" سنانے کو کہا جائے۔ لیکن انہوں نے کورم ٹوٹنے سے بچانے کا یہ طریقہ بتایا کہ ارکان کی گنتی ہی نہ کی جائے کہ گنتی ہو گی تو ارکان کی تعداد 1/4 سے کم نکلے گی اور کورم ٹوٹے گا۔ ہو سکتا ہے وہ چاہتے ہوں کہ ارکان اسمبلی کسی گنتی میں نہ آئیں۔ ویسے وہ ارکان بھی گنتی کے ہی ہیں جنہوں نے کبھی اسمبلی کی کارروائی مس نہیں کی۔ ایک صحافی نے بتایا۔ "مصطفیٰ کھر صاحب ایسے رکن اسمبلی ہیں جنہوں نے آج تک کبھی "مس" نہیں کی۔"

میچل فٹ نے کہا ہے۔ "محبت' جنگ اور پارلیمنٹ میں سب جائز ہے۔" سو اسمبلی کے ارکان چونکہ دور دراز علاقے سے آتے ہیں' ان کے آرام کے لیے اسمبلی میں کرسیوں کی بجائے چارپائیاں ہونی چاہئیں' تاکہ وہ آرام سے کارروائی کر سکیں۔ ویسے بھی ہم اس فرنیچر پر اچھی طرح بیٹھ نہیں سکتے' جس پر لیٹا نہ جا سکے۔ خان عبدالقیوم صاحب سے کسی نے پوچھا: آپ اجلاسوں میں سو سو کر بور نہیں ہوتے؟" تو انہوں نے کہا "جب بور ہوتا ہوں تو پھر سو جاتا ہوں۔" "لیکن آج کل تو بندہ اسمبلی میں آرام سے سو بھی نہیں سکتا' اسمبلی نہ ہوئی گھر ہو گیا۔ ویسے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسمبلی بھی "رش" لے تو ایک صورت یہ ہے کہ اسمبلی میں "خواتین" بھی ہونی چاہئیں۔ ایسے ہی مقصد کے حصول کے لیے بھارت کے ایک صوبے کی اسمبلی کی واحد خاتون رکن نے مطالبہ کیا تھا کہ اسمبلی میں کوئی "مرد" بھی ہونا چاہیے تو ارکان اسمبلی نے کہا: "اس سے ہمارا استحقاق مجروح ہوا ہے۔" لیکن ہمارے سیاست دان تو ایسے ہیں کہ انہیں اگر "بوندا باندی" پسند ہے تو اس کی وجہ یہ ہو گی کہ اس میں "باندی" بھی ہے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ پولیس کی ڈیوٹی لگا دی جائے کہ کورم پورا کرے کیونکہ گنتی پوری کرنے میں ان سے ماہر کون ہے...... ایک انسپکٹر نے کہا: "دو مجرم مجھے دیکھ کر نو دو گیارہ ہو گئے' وہ گرفتار ہونے چاہئیں۔" چند ہی گھنٹوں بعد حوالدار نے رپورٹ پیش کی کہ

سر گن لیں' نو اور دو پورے گیارہ ہیں۔ لیکن جارج ایس۔ کوفمین نے اس مسئلے کا حل یوں پیش کیا ہے کہ اسمبلی کے روزانہ اوقات کار بارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک کر دیئے جائیں' جس میں ایک گھنٹہ کھانے کا وقفہ ہو۔

○○○

• شیطان کی ریٹائرمنٹ

اشفاق احمد صاحب سارے کام دوسروں کو بتا کر نہیں کرتے' کچھ کام تو وہ خود کو بھی بتا کر نہیں کرتے۔ ہم سمجھتے رہے اردو سائنس بورڈ سے ریٹائرڈ ہونا ہی ان کی ذمہ داری ہے۔ یہ پتا نہ تھا کہ شیطان کو ریٹائرڈ کرانا بھی انہی کے ذمے ہے اور انہوں نے جولائی 1993ء میں شیطان کی ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا' جسے سنتے ہی ہمیں اپنی ذمہ داریوں میں اضافہ محسوس ہونے لگا ہے۔

"شیطان دیکھنے میں کیسا ہے؟" ایک بار ہم نے محلے کے مولوی سے پوچھا تو وہ جواب دینے کے بجائے ہمارا منہ دیکھنے لگا۔ شیطان رائٹر تو نہیں ہے' لیکن دنیا کی بیسٹ سیلر کتابوں کے مصنف اللہ تعالیٰ کے کلام میں اس کا بہت ذکر ہے۔ ہم نے بھی اپنی کتاب "شیطانیاں" کا انتساب شیطان کے نام کرنا چاہا تو پتا چلا کہ ہم سے پہلے یہ کام خاتون افسانہ نگار قدسیہ ہما نے کر دیا ہے۔ ان کی کتاب کا انتساب ہے "اپنے نام" شیطان ایک سیلف میڈ شخصیت ہے۔ وہ شخص جسے سب برا کہیں' اس کا برا ہونا مشکوک ہو جاتا ہے۔ شیطان کو پہلے صرف اچھے برا کہتے' اب تو اسے برے بھی برا کہنے لگے ہیں۔ مارٹن لوتھر نے کہا ہے "جہاں موسیقی ہو وہاں شیطان نہیں ہوتا" جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ سمجھتا ہے' یہاں تو میرے بغیر بھی کام چل رہا ہے' لیکن اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد کئی محفلیں اور وزارتیں خطرے میں پڑ جائیں گی۔ دنیا بالخصوص یورپ کو زنانہ لباس کی قلت کا سامنا ہو گا کہ اب تو ان ممالک میں زنانہ لباس آدھ گز میں بن جاتا ہے کیونکہ ہم نے ہیٹ آدھ گز سے کم کپڑے میں بنتے نہیں دیکھا' پھر تھان لگا کریں گے۔ یہی نہیں ہم آج تک سمجھتے رہے اشفاق احمد صاحب ان پڑھ "ملاؤں" کے حامی ہیں' مگر انہوں نے یہ اعلان کر کے ان کی روزی بھی چھین لی کہ وہ اسی کے خلاف تقریریں کر کے اتنا کماتے تھے کہ ہم نے ان کے بچے اور بیوی کبھی خالی

پیٹ نہ دیکھے۔ ہمیں اس اعلان پر فارغ التحصیل نوجوان بڑے خوش نظر آئے۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگے "ریٹائرمنٹ سے ایک اسامی تو خالی ہو گی!"

اشفاق احمد صاحب ہر چیز کا روشن پہلو دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ہماری نظر بھی ہمیشہ اسی پر پڑتی ہے جس سے پہلو روشن ہو سکے، لیکن اشفاق احمد صاحب تو بیسویں منزل سے گرنے والے کو بھی مایوس نہیں کرتے کہیں گے تم فکر نہ کرو انیسویں منزل تک تو تمہیں کچھ بھی نہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے صرف نئی بات کرنے کی کوشش میں یہ کہہ دیا ہو، کیونکہ وہ ہر بات الگ کرتے ہیں۔ انہوں نے بانو قدسیہ صاحبہ سے محبت کی وہ بھی سب سے الگ۔ اگرچہ محبت ہمیشہ الگ کر کے ہی کرنا چاہیے، لیکن اشفاق صاحب نے زمانہ طالب علمی میں پہلی بار اظہار محبت یوں کیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے کاریڈور میں بانو قدسیہ آ رہی تھیں تو اشفاق احمد صاحب نے ان کی طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا "ایک آنے کا سوال ہے؟" محترمہ نے پوچھا "اس کا کیا کرو گے؟" کہا "سگریٹ پیئوں گا۔" روزانہ اسی طرح اظہار محبت کرتا، یہاں تک کہ بات آنے سے چوانی تک آ گئی اور شادی ہو گئی، جس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سگریٹ نوشی کے کتنے دور رس نتائج نکلتے ہیں۔ شاید اسی لیے آج کل اشفاق صاحب نوجوانوں کو سگریٹ سے منع کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ ریٹائرمنٹ والی حرکت شیطان نے خود کی ہو، کیونکہ اس نے شروع دن سے ہی یہ قسم کھا رکھی ہے کہ وہ کبھی کوئی اچھا کام نہیں کرے گا۔ اسرارالحق مجاز صاحب زندگی کے آخری دنوں میں مستی کی اس حالت میں رہتے کہ انہیں تاریکی بھی اس وقت تک نظر نہ آتی، جب تک موم بتی نہ جلا لیتے۔ ایک بار مجلس وعظ میں چلے گئے۔ کسی آشنا نے پوچھا "آپ اور اس محفل میں......" کہا "جی ہاں، انسان کو بگڑنے میں کون سی دیر لگتی ہے" مگر ہمیں شیطان سے یہ توقع نہ تھی۔ جس طرح حنیف رامے صاحب اپنے نام کے ساتھ سابق وزیراعلیٰ لکھتے ہیں، ایسے وہ بھی خود کو سابق فرشتہ کہتا ہے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اسے کسی شیطان نے ورغلایا ہے لیکن

اسے شاید اندازہ نہیں کہ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ہوتا ہے؟ گوربا چوف سے سبق سیکھ لیتا' جب گوربی روس کے صدر تھے تو ایک صحافی نے رئیسہ سے پوچھا "گوربی کب گھر آئیں گے؟" رئیسہ نے کہا "وہ دو بج کر سنتالیس منٹ اور تیس سیکنڈ پر گھر آئیں گے' کیونکہ انہیں کئی ملکوں کا دورہ کر کے آنا ہے۔" پچھلے دنوں ایک صحافی نے پوچھا کہ گوربی گھر نہیں ہیں' کب تک آئیں گے تو رئیسہ نے جواب دیا "کیا پتا کب لوٹیں' کیونکہ وہ ڈبل روٹی خریدنے گئے ہیں۔" اگرچہ ہمیں شیطان کے اس عمل کی بھی ایسے ہی سمجھ نہیں آئی جیسے گوربی کے پریسٹرائیکا کی۔ چند برس قبل کسی نے ایک روسی سے پوچھا "پریسٹرائیکا کی سمجھ نہیں آئی؟" روسی کے پاس دو بالٹیاں تھیں۔ ایک خالی اور دوسری میں آلو۔ اس نے آلو پہلی بالٹی میں انڈیلنے شروع کر دیئے' صحافی نے پوچھا "مگر اس سے تو کچھ تبدیلی نہ ہو گی" تو روسی نے کہا "مانتا ہوں' مگر اس سے جو شور پیدا ہوتا ہے' وہ کمال کا ہے۔" سو شیطان کی ریٹائرمنٹ کا شور بھی ہمیں کمال لگا۔ ویسے بھی رمضان المبارک میں جب اسے ایک ماہ کے لیے قید کیا جاتا ہے تو ہم سارے کام اس کے بغیر چلا ہی لیتے ہیں' سو اگر وہ ریٹائرڈ ہو بھی گیا تو کیا!

○○○

• یادداشتیں اور یادداشتائیں

غلام مصطفیٰ کھر جب کئی برسوں کے بعد پاکستان آئے تو آتے ہی اپنے آبائی حلقے سے الیکشن جیت گئے۔ ہم نے کسی سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا "لوگوں کا حافظہ!" ہم نے کہا "اچھا! اس وجہ سے کہ لوگوں کو وہ کام یاد ہوں گے جو کھر صاحب نے اپنے دور میں کیے۔" کہا "نہیں، اس لیے کہ لوگوں کو وہ بھول گئے تھے۔" لوگوں کا ہی کیا خود ہمارا حافظہ ایسا ہے کہ کبھی امتحان میں حاصل کردہ نمبر یاد نہیں رہتے۔ کوئی پوچھے تو نمبر کی بجائے رول نمبر بتانا پڑتا ہے۔ خواتین کی یادداشت تو اتنی کمزور ہوتی ہے کہ انہیں اپنی عمر تک صحیح یاد نہیں ہوتی، یقین نہ آئے تو کسی سے پوچھ کر دیکھ لیں۔ ایک خاتون بھی اپنی ٹھیک عمر نہیں بتا سکتی۔ ہمیں تو بھول جانا اتنا بھاتا ہے کہ یاد بھی اپنی بھولی ہی رہتی ہے۔ ادیب تو اپنی یادداشتیں تک، یاد داشتاؤں کے حساب سے مرتب کرتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی صاحب نے جوش میں آ کر اپنی یادوں کو مرتب کیا تو کسی نے کہا "سو اس کا نام "یادوں کی با..... رات" رکھا جائے البتہ سیاستدانوں کی یادداشت ایسی ہوتی ہے کہ انہیں ہمیشہ یاد ہوتا ہے کہ کیا بھولنا ہے۔ بھول جانے کے بڑے فائدے ہیں۔ ان میں جو سب سے اہم ہے، وہ ہمیں یاد نہیں آ رہا مگر ہمیں یہ خیال تک نہ تھا کہ بھول جانا ایک دن اتنی بڑی خوبی بن جائے گا کہ صرف اس کے اظہار کے لیے غلام حیدر وائیں صاحب نے صحافیوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا "مجھے یاد نہیں آ رہا، جتوئی کی جماعت کونسی ہے؟" جب جتوئی صاحب سے وائیں صاحب کے اس بیان کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا "یہ وائیں کون ہے؟"

اگرچہ غلام حیدر وائیں صاحب کی عمر ایسی ہے جس میں بندہ خود کو آئینے میں دیکھ کر سوچنے لگتا ہے کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے؟" ویسے جتوئی صاحب کی جماعت اتنی بڑی ہے کہ یہ پوچھنا "جتوئی کی کونسی جماعت ہے؟" یادداشت سے کہیں زیادہ

نظر کی کمزوری لگتی ہے۔ پھر وائیں صاحب کو علم کا بہت شوق ہے' سو ممکن ہے کونسی جماعت پوچھنے سے مراد یہ ہو کہ جتوئی صاحب کونسی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وائیں صاحب سے نویں جماعت کے بعد کوئی پوچھتا "آج کل آپ کس جماعت میں ہیں؟" تو کہتے "مسلم لیگ میں ہوں۔" درویش وزیراعلیٰ ہیں' ان سے پہلے پنجاب کے درویش گورنر گزرے ہیں۔ لوگ اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے دور دور سے ان سے دعا کرانے آتے۔ گورنر صاحب دعا پر یوں "آمین" کہتے کہ ملازم امین بھاگا بھاگا آ کر کہتا "جی سائیں۔"

غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب تو جاگیردار ہیں' سو ان کی بات سمجھنے کے لیے بڑی سمجھ چاہیے۔ ایک بار پنجاب کے ایک جاگیردار سیاستدان نے کہا I am forgetting Girls تو ہم نے سب کو بتایا کہ موصوف تو بہ تائب بلکہ حفیظ تائب ہو گئے ہیں۔ اگلے دن ان کی کارروائی سے پتہ چلا کہ انہوں نے فرمایا تھا I am for getting Girls ہو سکتا ہے جتوئی صاحب نے "وائین" کہا ہو۔ آخر وہ "کھاتے پیتے" جاگیردار ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے وہ وائیں صاحب کو یاد کر رہے ہوں۔ ہمارے ایک جاگیردار وزیر بنے تو انہیں اس مقام تک پہنچانے کے لیے دن رات ایک کرنے والا دوست ملنے گیا اور شکایت کی کہ آپ ہمیں بھولنے کی کوشش کر رہے ہیں تو جاگیردار نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "نہیں میں تو آپ کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" ویسے جتوئی صاحب کی یادداشت ایسی ہے کہ اس عمر میں بھی کوئی کہے کہ الف ب سناؤ تو ایک منٹ میں فرفر اے سے زیڈ تک سنا دیں گے۔ بھٹو دور میں زیڈ سے اے کی طرف آتے تھے' وہ شریف آدمی ہیں اور شریف آدمی وہ ہوتا ہے جو بے خیالی میں کبھی کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ ہمیں تو لگتا ہے دونوں نے اپنے اپنے انداز میں ایک دوسرے کی تعریف کی ہے کیونکہ ہمارے ہاں جب عورتیں ایک دوسرے سے لڑتی ہیں تو وہ جو سب سے بڑی گالی دیتی ہیں' وہ یہ ہوتی ہے "نی! میں تجھے جانتی ہوں۔" اور دوسری کا یہ سنتے ہی رنگ فق ہو جاتا ہے۔ سو اگر وائیں صاحب کہتے "میں جتوئی کی پارٹی کو جانتا ہوں۔"

یا جتوئی کہتے "میں وائیں کو جانتا ہوں۔" تب پریشانی والی بات تھی۔ اب چونکہ وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے' سو یقیناً ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے ہوں گے' سو دونوں کو اس پر ناراض ہونے کے بجائے خوش ہونا چاہیے۔

○○○

• جناب مریض الملت صاحب

صاحب! مرد دو طرح کے ہوتے ہیں' ایک مرد اور دوسرے غیر مرد۔ ایسے ہی ڈاکٹر بھی دو طرح کے ہوتے ہیں' ایک ایم بی بی ایس جو علاج کرتے ہیں اور دوسرے پی ایچ ڈی' جو خود اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کا علاج کیا جائے۔ مریض بھی دو طرح کے ہوتے ہیں' ایک وہ جو آدھے ڈاکٹر ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو آدھے مریض ہوتے ہیں۔ قائد قلت نوابزادہ نصراللہ خان بھی قوم اور کمر کے درد میں مبتلا رہ رہ کر حکیم الامت نہ سہی نیم حکیم الامت تو بن ہی گئے ہیں مگر ہمیں یہ نہیں پتہ تھا کہ وہ اب ایلوپیتھی میں بھی "یہ ایلو ایلو کیا ہے؟" کرنے لگیں گے۔ ہم آج تک "اے پی سی" کو سیاسی جماعتوں کا اتحاد سمجھتے رہے مگر کل ایک ڈاکٹر کا نسخہ دیکھ کر پتہ چلا کہ یہ تو درد اور بخار کی دوائی ہے اور ڈاکٹر درد اور بخار کے مریضوں کو صبح' دوپہر' شام "اے پی سی" تجویز کرتے ہیں۔ اسی لیے اے پی سی کے ذکر پر نواز شریف صاحب کے چہرے کے وہی تاثرات ہوتے ہیں جو بچوں کے دوائی کا ذکر سن کر ہوتے ہیں۔ ویسے یہ حقیقت ہے کہ نوابزادہ صاحب نے کل جماعت اتحاد کیمیکلز کی طرف سے اے پی سی درد رکھنے والے لوگوں کے لیے ہی بنائی تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹروں نے بھی اس کا استعمال مریضوں کو شروع کروا دیا ہو۔

آج کل ڈاکٹر کے پاس جا کر کوئی مریض کہے کہ مجھے ایسی دوا دیں جس سے میری آنکھیں کھل جائیں تو ڈاکٹر ایسے مریض کو اکثر اپنا بل دکھاتے ہیں لیکن ہماری آنکھیں تو نسخے میں اے پی سی لکھا دیکھ کر ہی کھل گئی ہیں۔ اب پتہ چلا کہ نوابزادہ صاحب بھی ہماری طرح ریسرچ کے آدمی ہیں۔ ہم تو سارا دن اپنی جیبوں میں چابیاں سرچ کرتے رہتے ہیں اور نصراللہ خان صاحب مختلف جماعتوں کو ملا کر نئے مرکبات بناتے رہتے ہیں۔ کسی ایسے ہی شخص سے کسی نے پوچھا "آج کل آپ کیا کر رہے ہیں؟" کہا ریسرچ

کر رہا ہوں۔" پوچھا "کس پر ریسرچ کر رہے ہو؟" کہا "اس پر کہ آج کل میں کیا کر رہا ہوں؟" نوابزادہ صاحب نے حقے پر بھی پی ایچ ڈی کی ہے۔ یہ انہی کا دیا ہو فارمولا ہے کہ کوڑے تمباکو اور میٹھے گڑ کا حاصل جمع لذت کے راست متناسب ہوتا ہے۔

سنا ہے کہ حقے کا استعمال لقمان حکیم صاحب نے کھانسی کی دوا کے طور پر کیا' بعد میں یہ بیماری کے ایسے منہ لگا کہ اس کے بغیر بندے کو کھانسی نہیں آتی۔ ہمیں یاد ہے حقہ پینے والے ہمارے ایک جاگیردار دوست نے ساتھی لڑکی سے کہا۔ "دنیا میں بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ روز اتنے بندے مر جاتے ہیں جتنے میں سانس لیتا ہوں۔ بتاؤ! ایسے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟" تو اس نے کہا "ماؤتھ واش استعمال کرنا چاہیے۔" نوابزدہ صاحب حقوق کو حقہ کی جمع سمجھتے ہیں' اسی لیے عمر بھر حقوق کے لیے لڑتے رہے مگر آج کل ان کے منہ میں حقہ نہیں ہوتا۔ نہار منہ بھی ان کے منہ سے اے پی سی ہی ہوتی ہے۔

اگرچہ انہوں نے واضح طور پر اے پی سی کو قوم کی ہر بیماری کا علاج قرار دیا ہے مگر اس کی ترکیب استعمال نہیں بتائی۔ ہمیں یاد آیا خواجہ ناظم الدین صاحب اتنا کھاتے تھے کہ لوگ انہیں خواجہ ہاضم الدین کہتے۔ ایک بار انہوں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "مجھے بھوک بہت لگتی ہے' کوئی نسخہ بتائیں۔" ڈاکٹر نے کہا "آپ صبح ایک انڈہ' دو سلائس اور ایک گلاس دودھ بغیر چینی کے لیا کریں۔" تو خواجہ صاحب نے پوچھا "ناشتے سے پہلے یا بعد میں ؟" ایسے ہی نوابزادہ نصراللہ نے یہ نہیں بتایا کہ "کھانے" سے پہلے اے پی سی کی طرف رجوع کیا جائے یا "کھا پی" کر۔

نوابزادہ صاحب سے ایک بچے نے پوچھا "داد الجبرے کے اس سوال کا حل بتائیں۔" تو انہوں نے کہا "بیٹا! اس کا حل قومی حکومت ہے۔" وہ تو لاعلاج سے مراد بھی یہ لیتے ہیں "علاج لا۔" یہ انہیں کے دم قدم سے ہے کہ فروری میں مارچ شروع کر دیا گیا۔ اب وہ لانگ مارچ کا کہہ رہے ہیں' اسے 31 دنوں کی بجائے 35 یا اس سے زیادہ دنوں کا کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ وہ انہیں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ڈی ڈی ٹی

بھی شروع تو مچھر مارنے کے لیے کی گئی مگر اس طرح کہ وہ وقت بھی آیا جب وہ تمام مچھر مر گئے جنھوں نے ڈی ڈی ٹی نہ کھائی تھی۔ آج کی نئی مچھر نسل ڈی ڈی ٹی پر پروان چڑھی۔ ایسی ہی اے پی سی بھی ڈی ڈی ٹی ثابت نہ ہو۔

ooo

DIANA STY-ILL •

پاکستان ہیرڈریسرز ایسوسی ایشن کے جنرل سیکرٹری اسلام سلمانی صاحب بھی کمال ہیں۔ اس طرح کو استرا لکھتے ہیں۔ طبیعت ایسی کے ڈر ہی لگا رہتا ہے کہ ان کے سامنے کسی شاعر ادیب نے کسی خاتون کے بالوں کو دیکھ کر کہہ دیا کہ کیا ناگن زلفیں ہیں تو اسلام سلمانی صاحب اسے پکڑوا نہ دیں کیونکہ "اس نے زلفوں کو سانپ کہہ کر ہمارے پیشے کی توہین کی ہے۔" وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں اگر کسی مصور کی تصویر پسند آ جائے تو تصویر کی بجائے مصور کو ٹانگنے کا سوچتے ہیں۔ سو جہاں آج ہر کوئی لیڈی ڈیانا سے ملنے کی خواہش کر رہا ہے' انہوں نے ڈیانا کی بجائے اس کی ذاتی ہیرڈریسر سے ملنے کی "شدید" خواہش کا اظہار کر دیا اور ایک شدید عرض داشت صدر اور وزیراعظم نواز شریف صاحب کو لکھ دی کہ وہ ان کی "شدید" خواہش پوری کر کے بالوں کی سرپرستی کریں۔ اگرچہ یہ واضح نہیں ہے کہ وہ کس کے بالوں کی سرپرستی کریں' پھر نواز شریف صاحب کو یہ درخواست پیش کرنا ایسے ہی ہے جیسے امجد اسلام امجد کو ایک تقریب میں لوہے کی کنگھی پیش کی گئی تھی۔

ویسے ڈیانا برطانیہ کی رانی ہے تو ہمارے ہاں بھی نائی راجہ کہلاتے ہیں۔ لوگ رانی کے احترام میں نظریں جھکاتے ہیں تو ان راجوں کی دکانوں پر بڑے بڑوں کو سر جھکاتے' ہم نے خود دیکھا ہے۔ پھر ہمارے ہاں بالوں کو وہ مقام حاصل ہے کہ ہم نے ایک اہم رشتہ بالوں کے نام منسوب کر دیا جو "ہم زلف" کہلاتا ہے۔ پھر ہمارے ہاں جتنی حجامت تھانوں اور سکولوں میں بنتی ہے' اتنی ہیرڈریسر کی دکانوں میں بھی نہیں کی جاتی۔ سو اسی حساب سے یہ "شدید" مطالبہ صرف اسلام سلمانی صاحب کا ہی نہیں' ہر اس شخص کا بھی ہے جو "فارغ البال" نہیں۔

ہیر اسٹائلز بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا دور آتا ہے کہ پتہ نہیں چلتا' کوئی آ رہا ہے یا

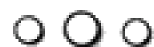
آ رہی ہے بلکہ "لیلیٰ نظر آتا ہے' مجنوں نظر آتی ہے۔"

کراچی کے شاعر جون ایلیا بھی اسی سٹائل کے نمائندہ ہیں۔ ایک لڑکے نے کہا "میں جون ایلیا صاحب کو ملا۔" تو دوسرے نے پوچھا "کہاں؟" کہا "میں نے ان کے بالوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر ہٹایا تو اندر وہ تھے۔" کہتے ہیں ایک بار وہ ڈاکٹر کے پاس گئے کہ چکر بہت آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے معائینے کے بعد انہیں کہا "یہ دوائی ہے۔ صبح' دوپہر' شام پانی کے ساتھ استعمال کریں۔" اور صابن کی ٹکیہ ان کی ہتھیلی پر رکھ دی۔ شاید ایسے ہی بالوں کی کٹنگ پر جولیو کو تارز نے کہا ہے کہ بال کاٹنا میٹا فزیکل آپریشن ہے لیکن یہی بال گرنے لگیں تو بندے کا سنبھلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ باب ہوپ سے کسی نے پوچھا "بال گرنے لگیں تو آدمی کیا کرے؟" باب ہوپ نے کہا "نیچے سے ہٹ جائے۔" ہمارے اپنے محلے کے حکیم نے ایسی دوائی بنائی جسے جو تین دن مسلسل استعمال کر لیتا' اس کے بال ساری عمر کبھی سفید نہیں ہوتے کیونکہ بال رہتے تو سفید ہوتے! سنا ہے سوچنے سے بال گر جاتے ہیں اور بندے کا "گنج" نکل آتا ہے۔ شاید اسی لیے عورتوں کے بال بڑے لمبے اور گھنے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں گنج کا مطلب خزانہ ہے۔ لگتا ہے یہ بات وزیرخزانہ سرتاج عزیز کو دیکھ کر کہی گئی ہے۔ اگرچہ وہ سرتاج بھی ہیں اور عزیز بھی لیکن ان سے پوچھا جائے کہ میں کنگھی کرتا ہوں' کونسا فعل ہے؟ تو کہیں گے "فعل ماضی۔" جہاں پہلے ہیر اسٹائلز تھا' اب صرف اسٹائل رہ گیا ہے۔ ہالی وڈ کی ایک اداکارہ نے سہیلی سے کہا "میرے دوسرے خاوند نے مجھے دنیا کا سرسبز خطہ دکھایا جبکہ تیسرے نے دنیا کا سب سے بے آباد اور ویران خطہ۔" سہیلی نے پوچھا "وہ کہاں واقع ہے؟" کہا "میرے تیسرے خاوند کی ٹوپی کے نیچے۔"

جیمز وویل نے کہا ہے ایک بال میں کھینچنے کی جتنی طاقت ہوتی ہے' اتنی سینکڑوں بیلوں کی جوڑوں میں بھی نہیں ہوتی۔ اس لیے ڈیانا کے بالوں کے پیچھے کچھی چلی آ رہی ہے۔

ایک خاتون نے ہیر ڈریسر سے کہا کہ مجھے لیڈی ڈیانا ہیر سٹائل بنا دیں۔ ہیر ڈریسر

نے خاتون کے بالوں کا وہ حلیہ بنایا کہ خاتون چلا اٹھی۔ "یہ کونسا ڈیانا سٹائل ہے؟" تو ہیر ڈریسر نے کہا "میں نے بیک وقت تمام ڈیانا ہیر سٹائل بنا دیئے ہیں۔" لگتا ہے اسلام سلمانی صاحب ڈیانا کی ذاتی ہیر ڈریسر سے یہ اسٹائل سیکھنا چاہتے ہیں۔ اب وہ انہیں ملتی ہے یا نہیں' اس کا تو علم نہیں البتہ اتنا پتہ ہے کہ اس سے پہلے ایک ایشیائی ملک کے ہیر ڈریسر نے اس سے کٹنگ سیکھی۔ ایک دن وہ کٹنگ کر رہا تھا تو لیڈی ڈیانا کی ذاتی ہیر ڈریسر اسے دیکھنے آئی تو اس نے کہا "محترمہ میں کل سے اپنے ملک جا رہا ہوں۔ بتایئے میں وہاں آپ کی کیا خدمت کروں؟" تو وہ بولی "میری یہی خدمت کافی ہو گی کہ کسی کو یہ نہ بتائیں کہ آپ کو کٹنگ میں نے سکھائی ہے۔"



• نقل مندی

کہتے ہیں نقل کے لیے عقل چاہیے حالانکہ اب تو عقل کی بھی نقل دستیاب ہے۔ یوں عقل مندی اب نقل مندی ہو کر رہ گئی ہے۔ مارکیٹ میں آپ کو ہر چیز کی نقل مل جائے گی۔ اب تو وزیر تک نقلی ملنے لگے ہیں۔ چند روز قبل حسنات نامی ایک شخص انارکلی لاہور کے سر رشتہ تعلیم کے ڈائریکٹوریٹ میں آیا اور خود کو وزیر ظاہر کر کے محکمہ تعلیم کے افسروں سے فراڈ کرنا چاہا' لیکن انہوں نے بھی نقلی وزیر کو مہمان خصوصی کے طور پر بلا کر پودا لگوانے کے بہانے پکڑوا دیا۔ اگرچہ خبر سے لگتا ہے کہ یہ سب محکمہ شجرکاری کی مہم کو سبوتاژ کرنے کے لیے کیا گیا ہے کہ اب تو ہم جیسا شخص بھی پودا لگاتا ہوا ڈرے گا کہ کہیں وزیر سمجھ کر دھر نہ لیا جاؤں۔ ویسے تو ہم بھی ایک ممبر کے اختلاف سے وزیر بننے سے رہے ہیں۔ ہوا یوں کہ جب ہمارا نام رکھا جانے لگا تو ایک رشتہ دار نے کہا "وزیر" نام ٹھیک رہے گا' مگر گھر کے ایک ممبر نے اختلاف کیا کہ وزیر زنانہ نام ہے۔ ہمارے ایک ادیب دوست نے تو اس زنانہ نام کا بڑا سکوپ بتایا ہے کہ اگر کسی کا نام وزیر بی بی ہو اور اس کی شادی کسی اعظم نامی شخص سے ہو جائے تو وہ گھر بیٹھے وزیراعظم کہلا سکتی ہے' بلکہ اب تو لگتا ہے پاکستان میں خواتین اسی طرح وزیراعظم بن سکیں گی۔

وزیر وہ ہوتا ہے جو وہ نہیں کرتا جو اسے کرنا ہوتا ہے اور وہ کرتا ہے جو اسے نہیں کرنا ہوتا۔ ہمارے ہاں اسمبلی میں ہر تیسرا رکن وزیر ہے' ہر پہلا رکن وزیر تھا اور ہر دوسرا رکن وزیر ہو گا۔ اتنے وزیر ہیں کہ بچے ان پر گنتی سیکھ سکتے ہیں۔ ایسے ہی ایک اخبار کے ایڈیٹر نے بہت زیادہ رپورٹر رکھے ہوئے تھے۔ اسے پتا چلا کہ شہر کی سب سے بڑی سڑک کے عین درمیان بجلی کے ننگے تار پڑے ہیں تو اس نے فوراً دو رپورٹر

بھیجے' ایک کو کہا "تم جا کر تار کو ہاتھ لگانا" اور دوسرے سے کہا "تم اس کی سٹوری لکھنا" اگرچہ اتنا تو ہمیں نہیں پتا کہ ان وزیروں سے اصل کیا کام لیا جائے گا' اتنا پتا ہے کہ ایک نئے وزیر اپنے دفتر گئے اور سٹاف کے ایک بندے سے پوچھا "تمہیں پتا ہے کہ میں کون ہوں؟" تو اس نے کہا "سر! آپ تشریف رکھیں' میں ابھی پتا کر کے آپ کو مطلع کرتا ہوں۔"

ایکسل ہوف نے کہا ہے کہ اگر آپ سو فیصد ذمہ داری دو آدمیوں میں برابر برابر تقسیم کریں تو ہر کسی کے حصے میں دس فیصد آتی ہے۔ یہی نہیں ہمارے دو ادیبوں نے مل کر ایک کتاب لکھی اور اس کی تقریب پر ایک نے کہا "اگر دوسرا کتاب لکھنے میں میری مدد نہ کرتا تو یہ کتاب اس سے آدھے وقت میں لکھی جا سکتی تھی۔" بہرحال وزیروں کے زیادہ ہونے سے کئی ملین ماہانہ کا خرچہ ہی نہیں بڑھا' ہمیں یہ مسئلہ بھی آن پڑا ہے کہ یہ کیسے پتا چلے گا کہ جو وزیر ہمیں مل رہا ہے وہ اصلی ہے نقلی نہیں۔ ویسے تو جو ہمیں مل رہا ہے وہ نقلی ہی ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں یہ پتا کرنا ہو کہ دوسرا جھوٹ بول رہا ہے یا سچ' تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس سے پوچھو "آپ جھوٹ بولتے ہیں؟" اگر وہ کہے "ہاں" تو بات واضح ہے اور اگر وہ کہے "نہیں" تو وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک دور میں برطانیہ میں یہ پتا کرنے کے لیے یہ عورت جادوگرنی ہے یا نہیں' اسے باندھ کر دریا میں پھینک دیتے۔ اگر وہ ڈوب جاتی تو اس کا مطلب ہوتا کہ وہ جادوگرنی نہیں تھی اور اگر وہ بچ جاتی تو اسے جادو گرنی مان لیا جاتا اور ان دنوں جادو گرنی کی سزا موت تھی جو اسے ملتی۔ دور کیا جانا ہے بلوچستان میں اکبر بگٹی کے قبیلے میں یہ پتا کرنے کے لیے کہ یہ اصلی مجرم ہے یا نہیں' اسے دو فٹ گہری ایک فٹ چوڑی دہکتے کوئلوں سے بھری کھائی میں ننگے پاؤں سات قدم چلایا جاتا ہے' پھر بکری کے خون سے اس کے پاؤں دھو کر دیکھا جاتا ہے۔ اگر اس کے پاؤں جلے ہیں تو وہ قصور وار۔ اگر آگ نہیں جلاتی تو قصوروار آگ دہکانے والا ہوتا ہے۔

کہتے ہیں ہٹلر نے اپنی کئی نقلیں تیار کر رکھیں تھیں یعنی ہو بہو ہٹلر سے ملتے جلتے ہم شکل افراد اکٹھے کر رکھے تھے۔ ایک جرمن آفیسر کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ اصل ہٹلر سے ہم کلام ہے یا نقلی سے' تو اس نے کہا "سر! آج میں نے ایک ہزار یہودی قتل کیے۔" تو ہٹلر نے بے ساختہ کہا "شاباش!" تو جرمن افسر فوراً بولا "آپ اصلی ہٹلر نہیں ہیں کیونکہ صرف ایک ہزار یہودیوں کو قتل کرنے پر ہٹلر شاباش نہیں دے سکتا۔"

ذہنی آزمائش کے امتحان میں طلبہ کو ایک تصویر دی گئی' جس میں ایک شخص پولیس کی وردی پہنے چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ پتا کرنا تھا کہ وہ اصلی پولیس والا ہے یا نقلی۔ ایک لڑکے نے تصویر دیکھتے ہی کہا "یہ نقلی ہے۔" ممتحن نے پوچھا "کیسے؟" لڑکے نے کہا "سر! اگر یہ اصلی ہوتا تو اس کا ہاتھ کبھی اپنی جیب میں نہ ہوتا۔" لیکن صاحب' ابھی تک ہمیں یہ پتا نہیں چلا کہ اصلی اور نقلی وزیر کا فرق کیسے کریں گے۔

ہم نے آئی جے آئی کے ایک نمائندے سے پوچھا تو اس نے کہا "اصلی وزیر وہ ہو گا جو لوگوں کے کام آئے گا۔" ایک ایسے ہی اصلی وزیر سے مقامی اخبار کے صحافی نے کہا "سر! آپ گھنٹہ لیٹ ہیں۔" تو وزیر موصوف نے کہا "دراصل راستے میں ایک اندھے کو سڑک پار کرانے لگ گیا۔" صحافی بہت متاثر ہوا اور پوچھا "لیکن سر! اس میں ایک گھنٹہ کیسے لگ گیا؟" تو وزیر نے کہا "گھنٹہ اس طرح لگ گیا کہ وہ اندھا سڑک پار کرنا نہیں چاہتا تھا۔"

○○○

• SO-CIA-LIST

ہمارے دوست صدیق کامریڈ صاحب کی سوشل لسٹ میں صرف سوشلسٹ ہوتے۔ مجھ سے تو وہ ہمیشہ ناراض ہی رہتے کہ میں جب انہیں "صدیق" کہتا تو "کامریڈ" رہ جاتا اور جب "کامریڈ" کہتا تو "صدیق" نہ کہہ پاتا۔ موصوف کو جو صدیق کامریڈ نہ کہتا وہ ان کی بے توجہگی کا شکار ہوتا اور جو کہہ دیتا وہ ان کی توجہ کا شکار ہو جاتا۔ آج کل وہ غسل خانوں کے اس قدر خلاف ہو گئے کہ وہ غسل خانے جن کی ٹوٹیاں تک ہمیشہ غسل کرتی رہتی ہیں' وہ وہاں بھی غسل فرمانے آئیں تو غسل پر کچھ فرما کر واپس چلے جاتے ہیں۔ اگر نہانا ہی پڑ جائے تو اکثر نہاتے وقت پانی لگانا بھول جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک غسل خانوں کا سوشلزم کے زوال میں بڑا ہاتھ ہے' جس کی وجہ کچھ یوں ہے کہ روس میں کمیونزم کو آخری دھکا دینے والے بورس یلسن کی کامیابی کے پیچھے کوئی عورت نہیں بلکہ غسل خانہ ہے۔ بورس یلسن کی والدہ کہا کرتیں کہ میرا بیٹا مستقبل کا معمار ہے کیونکہ ان کے خاندان کے لوگ عمارتیں ہی تیار کرتے۔ اس لیے دادا جان نے یہ شرط رکھی کہ اگر تم اکیلے غسل خانہ بنا کر دکھا دو تو میں تمہیں اعلیٰ تعلیم کی اجازت دے دوں گا اور یلسن نے اکیلے غسل خانہ بنایا اور اسے یورال پولی ٹیکنیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔ اگرچہ اس کا تعلیمی ریکارڈ ایسا تھا کہ وہ ریکارڈ توڑ تو نہ سکا' صرف پھاڑ ہی سکا۔ اسے سکول سے جو سند ملی اس پر لکھا تھا کہ اس میں نظم و ضبط کی کمی ہے۔ واقعی نظم بلکہ نظموں کی اس کے پاس کمی تھی۔ ضبط کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔ ایک سفری بیگ تھا جسے سفری اس لیے کہتے کہ وہ اس کے پردادا سے سفر کرتا ہوا اس تک پہنچا تھا۔ ایک دوست نے پوچھا "یلسن! تم اس بیگ کا کیا کرو گے؟" تو اس نے کہا "میں اس میں کپڑے رکھوں گا۔" تو دوست بولا "پھر تم پہنو گے کیا؟"

زار روس کے بعد بے زار روس میں وہ دور آیا جب کے جی بی کا دور تھا۔ اس دور میں کے جی بی کے اہلکاروں نے ایک ڈینٹل ڈاکٹر کو پکڑ لیا کہ یہ اپنے کلینک پر ہر آنے والے کو منہ کھولنے پر اکساتا ہے۔ ان دنوں روس میں بھی امریکہ کی طرح ہوٹل کے ہر کمرے میں ٹی وی آپ کو دیکھتے۔ کے جی بی کا ایک سابق اہلکار کہتا ہے کہ ہم کسی کو روس میں بھوکا نہ دیکھتے‘ سو جو بھوکا ہوتا اسے نہ دیکھتے۔ ایک بار کے جی بی کا نیا آفیسر آیا۔ وہ کبھی اپنی میز کمرے میں لگواتا‘ کبھی برآمدے میں اور کبھی صحن کے باہر‘ یہاں تک کہ ایک دن اس نے غسل خانے میں اپنی میز لگوا لی تو اس کے معائنے کے لیے ایک سائیکاٹرسٹ کو بلایا گیا جس نے پوچھا "آپ بار بار اپنی میز کی جگہ تبدیل کرتے ہیں اور پھر آپ کو غسل خانے میں آفس لگانے کی کیا سوجی؟" تو نئے آفیسر نے کہا "اس لیے کہ یہ واحد جگہ ہے جہاں لوگوں کو یہ تو پتا ہوتا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟" برژنیف کے دور میں ایک گھر کے صدر دروازے پر شور اور دروازے توڑنے کی آوازیں سن کر اہل خانہ سہم گئے۔ آخر ایک بوڑھے نے حوصلہ کیا مرنا تو ہے ہی‘ اگر کے جی بی والے لے بھی گئے تو کیا۔ سو اس نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا تو پتا چلا کہ باہر آگ لگی ہوئی ہے تو وہ خوشی سے چلایا "بچو! آؤ دیکھو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہمارے گھر کو صرف آگ لگی ہے۔"

ایک روسی شوفر امریکی اتاشی کی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ ایک عمارت کے پاس سے گزرا تو اس نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ماسکو کی سب سے بلند عمارت ہے۔" امریکی اتاشی نے دیکھا تو یہ کے جی بی ہیڈ کوارٹر کی عمارت تھی جو ذرا بھی بلند نہ تھی۔ بہرحال وہ چپ رہا جب شوفر نے یہی بات دہرائی تو اس نے پوچھا کہ یہ ماسکو کی سب سے بلند عمارت کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اردگرد کی عمارتیں اس سے بلند ہیں؟ تو روسی شوفر نے کہا "سر! یہ تو اس قدر بلند ہے کہ اس کے تہہ خانوں سے آپ سائبیریا جانے والے تمام راستے دیکھ سکتے ہیں۔" اس زمانے میں کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی انگریز کو لطیفہ سنائیں تو وہ تین بار ہنستا ہے۔ ایک بار اخلاقی طور پر پھر جب دوسرے

ہنستے ہیں ان کے ساتھ اور تیسری بار اس وقت جب اسے سمجھ آتی ہے۔ جبکہ امریکی ایک بار بھی نہیں ہنستا کیونکہ اس نے یہ پہلے ہی سن رکھا ہوتا ہے۔ جب کہ روسی لطیفہ سن کر بھاگ اٹھتا ہے۔ پوچھا "وہ کیوں بھاگتا ہے؟" کہا اس لیے کے جی بی کے دفتر سے پتا کر سکے کہ اس لطیفے پر ہنسنا ہے یا نہیں۔

سوشلسٹ وہ شخص ہوتا ہے جو چاہتا ہے غیر مساوی آمدنی کی مساوی تقسیم ہو اس معاشرے کی تصویر کچھ یوں ہوتی ہے۔

1۔ سوشلزم میں ہر بندہ کام کرتا ہے مگر پھر بھی گھر میں کچھ جمع نہیں ہوتا۔

2۔ گھر میں کچھ جمع نہیں ہوتا مگر ہر آدمی کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔

3۔ ہر آدمی کے پاس سب کچھ ہوتا مگر ہر آدمی مطمئن نہیں ہوتا۔

4۔ ہر آدمی غیر مطمئن ہوتا ہے لیکن پھر بھی وہ اس سسٹم کا ہوتا ہے۔

5۔ ہر آدمی اس سسٹم کا ہوتا ہے مگر کوئی کام نہیں کرتا۔

6۔ کوئی کام نہیں کرتا مگر کوئی بے روزگار نہیں ہوتا۔

JOAD کہتا ہے "سوشلزم اس ہیٹ کی طرح ہے جس کا لوگوں نے کثرت استعمال سے حلیہ بگاڑ دیا ہے۔" بلکہ اب تو روس میں اس ہیٹ کے سپیلنگ HAT کے بجائے HATE ہیں۔ ہمارے کامریڈ دوستوں کو اس تبدیلی پر کیا پریشانی ہوئی' اس کا تو پتا نہیں' البتہ ہمیں بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ پہلے ہم اس لیے پریشان رہتے کہ ہمارے منہ پر صدیق کامریڈ نہ چڑھتا اور اب یہ پریشانی ہے کہ ہمارے منہ پر چڑھا ہوا ہے۔ پہلے وہ اس بات پر ناراض رہتا کہ ہم اسے صدیق کامریڈ کہہ کر کیوں نہیں بلاتے' لیکن اب اس بات پر ناراض رہتا ہے کہ ہم اسے صدیق کامریڈ کہہ کر کیوں بلاتے ہیں؟

○○○

• نواز شریف الیون بمقابلہ جان میجر الیون

صاحب کرکٹ اور کوڑا کرکٹ ہماری کس گلی میں نہیں ہوتا؟ ضیا دور میں تو کوڑے اور کرکٹ کو بڑا عروج ملا اور اب وزیراعظم پاکستان نواز شریف نے برطانوی وزیراعظم کو

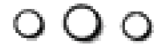
کرکٹ میچ کا چیلنج کر کے اسے باقاعدہ سیاسی کھیل بنا دیا ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ نواز شریف اور جان میجر میں یہی قدر مشترک ہے کہ دونوں نے خواتین سے اقتدار چھینا۔
اب پتا چلا کہ دونوں کرکٹر بھی ہیں۔ نواز شریف صاحب دیکھنے میں ایسے ہیں کہ کالج میں ان کے استاد مشکور حسین یاد صاحب کھڑا کر کے پوچھتے "مسٹر! تم کلاس میں ہنس کیوں رہے ہو؟" تو نواز شریف صاحب کہتے "سر! میں ہنس تو نہیں رہا میری شکل ہی ایسی ہے۔" اور جب برطانوی وزیراعظم جان میجر سے سکول میں ٹیچر نے پوچھا "مسٹر تم نے کیا کہا کہ لڑکے ہنس رہے ہیں؟" تو جان میجر نے کہا "سر! میں نے کہا تو کچھ نہیں میری شکل ہی ایسی ہے۔" جس طرح ہمارے وزیر خزانہ سرتاج عزیز کو ہر خاتون سرتاج کہتی ہے ایسے ہی جان میجر ان لوگوں میں سے ہیں جن کو خواتین ہمیشہ جان کہہ کر بلاتی ہیں۔ وہ اس لیے میجر ہیں کہ ان کے خاندان میں جو پیدا ہوتا ہے میجر ہی ہوتا ہے۔ ان کے والد کو جنوبی افریقہ میں صرف ان کے نام کی وجہ سے پکڑ لیا گیا لوگ سمجھتے رہے کہ یہ اصلی میجر ہے۔ جان میجر کا قد اتنا لمبا ہے کہ اسے بس کنڈیکٹر کی نوکری صرف اس لیے نہ مل سکی کہ اگر وہ بس میں کھڑا ہوتا تو بس کی چھت کھڑی نہ رہ سکتی۔ ان جیسے قد کے کسی بندے سے دوسرے نے سخت گرمی میں پوچھا "بتاؤ! کیسا موسم ہے؟" تو اس نے کہا "سینے تک تو سخت گرمی ہے' البتہ سر تک پہنچتے پہنچتے موسم خوشگوار ہو جاتا ہے۔"
امریکیوں اور انگریزوں میں یہ فرق ہے کہ جتنی دیر انگریز عورت سے تعارف میں لگاتے ہیں اتنی دیر میں امریکی ہنی مون منا کر بھی لوٹ آتے ہیں جبکہ پاکستانیوں اور انگریزوں

میں یہ فرق ہے کہ ہم سمجھتے ہیں زندگی ایک کھیل ہے جبکہ انگریز سمجھتے ہیں کرکٹ ایک کھیل ہے۔ جوانی میں جان میجر جس دن کرکٹ نہ کھیلتے اس دن انہیں تھکاوٹ سے نیند نہ آتی۔ باؤلنگ کرتے تو ان کے قد کی وجہ سے بیٹسمین کو لگتا گیند سامنے سے نہیں اوپر سے آ رہی ہے۔ اگرچہ ہمارے نواز شریف صاحب ایسے کپتان ہیں کہ ہر میچ سے کپ تان کر ہی نکلتے ہیں۔ البتہ مزاج ایسا ہے کہ چوکا لگا کر بھی باؤلر کی طرف یوں دیکھتے ہیں جیسے چوکا انہوں نے نہیں باؤلر نے لگایا ہے۔

نواز شریف الیون میں کون کون ہو گا' اس کا پتا نہیں' اتنا پتا ہے کہ ہمارے پرانے کھلاڑیوں میں نوابزادہ نصراللہ صاحب بھی ہیں۔ چیف کالج میں ان کے کلاس فیلو مہاراجہ پٹیالہ نے کرکٹ کھیلتے وقت رنز بنانے کے لیے علیحدہ ملازم رکھا ہوتا تھا جو سکور کے لیے دوڑتا' البتہ نوابزادہ صاحب باؤنڈری پر بیٹھ کر گیندیں "جمع" کرتے۔ پیر صاحب آف پگاڑہ کو اس "مبینہ" ٹیم میں ضرور شامل کرنا چاہیے' گگلی ایسی پھینکیں گے کہ کسی کے پلے کچھ نہ پڑے گا' لیکن ساتھ محمد خان جونیجو کو لے جانا پڑے گا کیونکہ ممکن ہے پیر صاحب کا پٹھا چڑھ جائے تو پھر کسی اور "پٹھے" کو میدان میں لانا پڑے۔ فاسٹ باؤلر کے طور پر شیخ رشید ہی کافی ہیں' کیونکہ وہ اس قدر تیز ہیں کہ ایک اوور میں پندرہ گیندیں پھینک سکتے ہیں۔ یہی نہیں وہ واحد کھلاڑی ہیں جو ابھی تک واحد ہیں اور بیک وقت باؤلنگ اور بیٹنگ کر رہے ہوتے ہیں' لیکن احتیاط کرنا پڑے گی کیونکہ وہ اس قدر تیز ہیں کہ یہ نہ ہو وہ میچ شروع ہونے سے پہلے ہی باؤلنگ کرانے لگیں۔ اصغر خان کو اوپنر بیٹسمین کے طور پر کھلایا جا سکتا ہے پھر ان کا یہ بھی فائدہ ہو گا کہ اگر ٹیم ہار گئی تو "اپیلیں" شروع کر دیں گے کہ دھاندلی ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے وائٹ بالوں پر وائٹ پیپر نکال دیں۔ لیکن اگر مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کو ٹیم میں شامل کیا جائے تو ان کی طرف دیکھ کر "وائٹ بال" نہ پکارا جائے' یہ نہ ہو وہ کسی کو خضاب لینے بھیج دیں۔ بہرحال اگر نواز شریف صاحب جیت کو یقینی بنانا چاہتے ہیں تو اصغر خاں

کو مخالف ٹیم کی طرف سے کھلائیں۔ ولی خان صاحب سے فیلڈنگ کرانے کے لیے انہیں کارنر پر رکھیں' لیکن انہیں وقفے وقفے سے بتاتے رہیں کہ آپ کو کس ٹیم کے خلاف کھیلنا ہے' لیکن پھر بھی وہ میچ کے بعد یہی کہیں گے کہ ہم دو گولوں سے جیت گئے۔ اقبال احمد خان بارہویں کھلاڑی بلکہ باہرویں کھلاڑی کے طور پر لیے جا سکتے ہیں پھر ان میں یہ خوبی بھی ہے کہ ہمیشہ ناٹ آوٹ رہتے ہیں۔ کسی کرکٹر نے مینجر سے پوچھا: "مجھے ایسا گر بتائیں کہ میں ہمیشہ ناٹ آوٹ رہوں۔ کہا "اس کا صرف ایک طریقہ ہے' وہ یہ کہ تم کبھی بیٹنگ نہ کرنا۔" اگر حنیف رامے کو بھی بارہویں کھلاڑی کے طور پر لیا جا سکتا ہے' مگر یہ نہ ہو کہ میچ کا پانسا بدلنے کے بجائے وہ ٹیم ہی بدل لیں۔ مصطفیٰ کھر سے کیپنگ کروائیں انہیں بس اتنا کہہ دیں کہ گیند آنا نہیں آتی ہے' پھر دیکھیں کوئی گیند ان سے بچ کر کیسے جاتی ہے؟ پھر "رن" کے لیے بھاگنا ہو تو سب سے تیز بھاگنے والا "مرد" کھر ہی ہو سکتا ہے۔ مستقل عارضی نگران کپتان کے طور پر غلام مصطفیٰ جتوئی کے تجربے کا بھی نواز شریف الیون کو فائدہ اٹھانا چاہیے۔ قاضی حسین احمد بڑی بولڈ باوَلنگ کرتے ہیں' بال کمال کے پھینکتے ہیں' بیٹسمین کے طور پر چھکے لگا سکتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شخص نے کہا "مجھ سے زور دار ہٹ نہیں لگتی۔" دوسرے نے کہا "جب گیند تمہاری طرف آئے تو گیند کو اپنا باس سمجھ لیا کرو پھر دیکھنا کیسی ہٹ لگتی ہے۔" سو قاضی صاحب بھی گیند کو الطاف حسین یا ولی خان سمجھ لیں تو چھکے ہی چھکے۔ الطاف حسین صاحب کو بھی ٹیم میں شامل کیا جا سکتا ہے لیکن پھر امپائر کی جگہ پر ڈاکٹر رکھنا پڑے گا تاکہ وہ خود کو ہسپتال میں سمجھ کر دلجمعی سے کھیلیں۔ مولانا نیازی صاحب کو ڈنڈے سمیت باؤنڈری پر کھڑا کر دیں پھر دیکھیں کسی بیٹسمین میں اتنا حوصلہ ہے کہ چوکا لگا سکے۔ بہرحال ان کے ساتھ کوثر نیازی صاحب کو کھڑا کرنا پڑے گا کیونکہ ساتھ کوئی ایسا تو ہو جو جھک کر گیند پکڑ سکے۔ عبدالستار نیازی نے تو جھکنا ہی نہیں۔ فور فٹ پر جا کے کھیلنے کے لیے جام صادق صاحب سے اچھا کھلاڑی

تو ہو ہی نہیں سکتا' پھر وہ دوسرے کھلاڑیوں کو صحت مند اور جراثیموں سے پاک رکھ سکتے ہیں' کیونکہ ان کے بیان ایسے ہوتے ہیں کہ بندہ کھولنے لگتا ہے اور سائنس کہتی ہے جو چیز کھول رہی ہو اس میں جراثیم مر جاتے ہیں۔ بہرحال یہ ٹیم محترمہ بینظیر بھٹو کے بغیر مکمل نہیں ہو گی۔ یوں بھی آؤٹ کے لیے ان سے اچھی اپیل کون کر سکتا ہے۔ لیکن ان سے اپیل کرنا پڑے گی کہ نواز شریف کو دیکھ کر "نوبال" نہ کہیں۔ کھیل میں ذاتیات پر نہیں اترنا چاہیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ نوابزادہ نصراللہ خان صاحب کے ساتھ مل کر نواز شریف الیون کے بجائے میچ کے لیے قومی حکومت کی طرز پر قومی ٹیم تشکیل کا مطالبہ کر دیں۔



• کلنک کا ٹیکہ

اگرچہ ملک معراج خالد صاحب کا لہجہ شروع سے ہی ایسا رہا ہے کہ کلنک کا ٹیکہ کہیں تو لگتا ہے کلینک کا ٹیکہ کہہ رہے ہیں مگر ہمیں یہ امید نہ تھی کہ ایک دن سچ مچ وہ یہ کر بھی دکھائیں گے۔ ایفروایشین سائیکالوجیکل کانفرنس پر ملک بھر سے سائیکالوجسٹ اور مریض مدعو کیے گئے تھے۔ جب وہاں ملک معراج خالد کو مہمان خصوصی کے طور پر دعوت دی گئی تو وہیں ہمارا ماتھا ٹھنکا اتنا تو ہمیں پتہ تھا کہ انہیں دعوت بحثیت سائیکالوجسٹ نہیں دی گئی لیکن ملک معراج خالد صاحب نے وہاں باقاعدہ سائیکالوجسٹ بن کر سیاستدانوں کی تشخیص کر دی اور ان میں سے 90 فیصد کو پاگل قرار دے دیا۔ اگرچہ اس سے پہلے رشید چودھری صاحب کا خیال رہا ہے کہ تمام سیاستدانوں کا ذہنی معائنہ ہونا چاہیے لیکن ایک ہی سیاستدان کے ذہن کا معائنہ کرنے کے بعد انہوں نے کہا کہ مجھے تو کچھ نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے ملک صاحب ان پاگلوں کے علاج کے لیے کلینک بھی کھول لیں۔

ملک صاحب سابق وزیر زراعت' سابق وزیر قانون' سابق وزیر اعلیٰ بنے تو کرائے کے مکان میں رہنے والا ہر شخص خوش تھا اور خوشی کی وجہ یہ تھی کہ اگر ملک صاحب وزیر اعلیٰ بن سکتے ہیں تو پھر وہ بھی بن سکتا ہے۔ ویسے بھی ہمارے ایک صوبائی وزیر تعلیم نے کہا تھا کہ پاکستان میں ہر کسی کو ترقی کے یکساں مواقع ملتے ہیں' مجھے ہی دیکھیں۔ پچھلے سال مجھے ایجوکیشن کے سپیلنگ نہیں آتے تھے اور اس سال میں ایجوکیشن منسٹر ہوں۔ یہ ہے بھی ٹھیک۔ ہمارے تو ایک وزیر خارجہ سے کسی نے پوچھا "مس پی کے بارے میں کچھ بتائیں؟" تو اس نے کہا "میں کسان آدمی ہوں' مجھے خواتین کے بارے میں اتنا علم نہیں۔"

ملک صاحب نے جب وکالت شروع کی تو ایک کلائنٹ نے کہا "سچی بات ہے کہ آپ کی عمر اس کیس کو ڈیل کرنے کے لیے تھوڑی ہے۔" تو ملک صاحب نے کہا "آپ

تسلی رکھیں کیونکہ جب تک میں یہ کیس فیصلہ کن مراحل تک لاؤں گا‘ تب تک میری عمر اتنی ہو چکی ہو گی۔“ ملک صاحب صفائی کا اس قدر خیال رکھتے تھے کہ وکیل صفائی

نہ بھی ہوں تب بھی مخالف وکیل کی صفائی ہی کرتے ہیں۔ مزاج کے اتنے ٹھنڈے کہ شدید گرمی میں بھی پارٹی کی شریک چئیر پرسن کو ان کی موجودگی میں گرم چادر لینا پڑتی ہے۔ بلند آواز میں بول رہے ہوں تو بندہ سمجھتا ہے سرگوشیاں کر رہے ہیں اور سرگوشیاں کر رہے ہوں تو لوگ سمجھتے ہیں چیونگم چبا رہے ہیں۔ جب ملک صاحب وزیر اعلیٰ تھے‘ کسی نے ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے شکایت کی کہ ملک صاحب بہت پریشان ہوتے ہیں۔ بھٹو صاحب نے پوچھا ”کیا کہتے ہیں؟“ کہا ”کچھ نہیں کہتے‘ اسی لیے تو پریشان کرتے ہیں۔“ گھر کے علاوہ ہر جگہ معزز مہمان ہوتے ہیں۔ جس اسمبلی کے اسپیکر بن جائیں‘ وہ ٹوٹ جاتی ہے یا جس اسمبلی کو توڑنا ہو‘ ملک صاحب کو اس کا اسپیکر بنا دیا جاتا ہے۔ جب وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ تھے تو ان دنوں جی ایم غیر سید پنجاب کے گورنر تھے۔ ملک صاحب گورنر ہاؤس گئے تو انہیں یہ کہہ کر روک دیا گیا کہ اندر گورنر صاحب کابینہ کے اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا‘ آپ اندر چٹ بھجوا دیں‘ میں انتظار کرتا ہوں۔“ غریبوں سے بے اختیار محبت کرتے ہیں حالانکہ غریب بااختیار محبت چاہتے ہیں۔ 1988ء میں حلقے برادری کے لوگ بڑی امیدیں لے کر ان کے پاس اسلام آباد گئے‘ ان دنوں ملک صاحب قومی اسمبلی کے اسپیکر تھے۔ ملک صاحب نے ان سے پوچھا:

”میرا عہدہ کتنا بڑا ہے؟“

”بہت بڑا ہے سر‘ بہت بڑا!“

”کیا میرے پاس ذاتی مکان ہے؟“

”نہیں سر! کرائے کا ہے۔“

”کیا میں نے کوئی مل یا پلاٹ لیا؟“

”نہیں سر! بالکل نہیں۔“

”میں اتنے بڑے عہدے پر ہو کر اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا تو آپ کے لیے کیا کر

سکتا ہوں!"

حنیف رامے صاحب سے کسی نے کہا کہ لوگ آپ کی بنی ہوئی تصویریں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ حنیف رامے صاحب نے کہا "کیا مطلب! لوگ یہ سوچتے ہیں کہ میں نے یہ کیسے بنائیں؟" اس نے کہا "نہیں سر! لوگ یہ سوچتے ہیں کہ یہ کیوں بنائیں؟" لوگوں کی یہی حالت ملک صاحب کا بیان پڑھ کر ہوئی ہے۔ سو یہ پڑھ کر کہ 90 فیصد سیاستدان پاگل ہیں' ہماری حالت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ اگرچہ سیاستدان اتنی بیان بازی کرتے ہیں کہ آپ انہیں پاغل تو کہہ سکتے ہیں۔ جس سوسائٹی نے بندے کو اپنی تقریب میں مہمان خصوصی بنایا ہوتا ہے' اسے کچھ نہ کچھ حسب توفیق دیا تو جاتا ہے سو ہو سکتا ہے ملک صاحب نے ایفرواشین سائیکالوجیکل سوسائٹی کو یہ خوشخبری دی ہو کہ دل چھوٹا نہ کریں' مریض بہت اور ساتھ ہی اپنی پوری برادری پیش کر دی۔ حالانکہ یہ برادری شیزوفرینا میں نہیں' سیاسوفرعونیا میں مبتلا ہے لیکن ہمارا خیال ہے ملک صاحب نے 90 فیصد سیاستدانوں کو پاگل اس لیے کہا ہے کہ پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن کو خوش کر سکیں کہ میں نے دس فیصد حضرات یعنی "مسٹر ٹین پرسنٹ" کو پاگل نہیں کہا۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا ہے انہوں نے 90 فیصد کو پاگل اس لیے مانا ہو کہ باقی دس فیصد کو وہ سیاستدان ہی نہ مانتے ہوں۔

○○○

• شعر انگیزیاں

گزشتہ کئی ہفتوں سے پنجاب اسمبلی نے اپنی شعر انگیزیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ اخباری اطلاع کے مطابق قائد حزب اختلاف اکرام ربانی صاحب نے جناب غلام حیدر وائیں صاحب کو بتایا ہے کہ وہ بھی آج کل شعر یاد کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اکرام ربانی صاحب کو شعر یاد نہیں رہتے جو یاد رہتے ہیں وہ شعر نہیں رہتے اور اگر بڑی محنت سے کوئی شعر یاد رہ ہی جائے تو پھر یہ یاد نہیں رہتا کہ یہ یاد کیوں کیا تھا؟ اگرچہ ان کی نثر پر بھی بری داد ملتی ہے بہ جا بہ جا ہوتی ہے شاید اسی لیے غلام حیدر وائیں صاحب نے انہیں شعروں کی طرف لگا دیا ہے تاکہ وہ گھر میں ہی اتنے الجھے رہیں کہ اسمبلی کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہ بچے۔ کیونکہ آپ اردو کا کوئی شعر گھر میں پڑھ لیں اس میں عاشق اور معشوق کا اتنا ذکر ہوتا ہے کہ بیوی ایک دن سن لے تو کئی دن آپ کی نہیں سنے گی۔ یا تو پھر بندہ جام صادق صاحب کی طرح ہو کر عاشق معشوق کا جتنا مرضی ذکر کر لے کوئی پوچھے تو کہہ دے "میں اپنے بیٹوں جام عاشق اور معشوق کا ذکر کر رہا ہوں۔" پھر جام صاحب تو نام سے ہی عشق حقیقی کے بندے لگتے ہیں۔

اکرام ربانی صاحب کا خاندان ایسا کہ خواتین اردو شعروں تک سے پردہ کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ وہی نہ ہو جو شوکت تھانوی صاحب کے ساتھ ہوا۔ ان کی غزل ایک رسالے میں چھپی جس کا ایک شعر تھا۔

ہمیشہ غیر کی عزت تیری محفل میں ہوتی ہے
تیرے کوچے میں جا کر ہم ذلیل خوار ہوتے

ان کے والد نے پڑھا تو غصے سے آگ بگولہ ہو کر ان کی والدہ سے کہا: "آخر اس آوارہ گرد کو اس کوچے میں جانے کی ضرورت کیا تھی؟" ماں نے منت کرتے ہوئے کہا۔ "بچہ ہے غلطی سے چلا گیا ہو گا منع کر دوں گی آئندہ اس کوچے میں نہیں جائے گا۔" پھر شعروں کے انتخابات نے غالب کو ہی نہیں پنجاب اسمبلی کے ایک معزز رکن کو بھی رسوا کر دیا تھا۔ انہوں نے اسمبلی میں علامہ اقبال کا ایک شعر پڑھا جو ان کی نظم مکالمہ جبریل و ابلیس سے تھا۔ معزز رکن نے بڑے جوش میں آ کر کہا کہ یہ شعر علامہ اقبال نے تم جیسے لوگوں کے لیے کہا ہے تو ایک رکن نے کھڑے ہو کر کہا: "آپ واقعی ٹھیک کہتے ہیں کیونکہ یہ شعر اس نظم میں ابلیس کے منہ سے کہلوایا ہے۔"

بچپن ہر کسی کو اچھا لگتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بچپن میں آپ کے بچے نہیں ہوتے۔ ربانی صاحب کو بچپن ہی سے سیاست سے لگاؤ تھا اس لیے سکول میں کام نہ کرتے تو ماسٹر صاحب کھڑا کر دیتے' محلے میں کام کرنے لگے تو محلے والوں نے کھڑے کر دیا۔ نظر اتنی کمزور ہے کہ عینک کے بغیر دور تک سوچ بھی نہیں سکتے۔ اخبار پڑھ رہے ہوں تو لگتا ہے پروف ریڈنگ کر رہے ہیں۔ اپنا علم اپ ٹوڈیٹ رکھنے کے لیے جہاں دوسرے سیاست دان "ڈیٹ" کا علم رکھتے ہیں وہاں یہ بیوی سے بچوں کی عمر اور کلاس کا پوچھتے رہتے ہیں۔ بچپن ہی سے شعروں کے ساتھ وہ سلوک کرتے جو لوگ شاعروں کے ساتھ کرتے ہیں۔ بہرحال آج کل انہیں شعر یاد کرنے پڑ ہی گئے ہیں تو اس کا سب سے آسان طریقہ ہم بتا دیتے ہیں اور وہ ہے خود شعر کہنے لگیں۔ چونکہ وہ قائد حزب اختلاف ہیں اس لیے اپنا تخلص اختلافی رکھ سکتے ہیں اتفاقی اس لیے نہیں رکھ سکتے کہ اتفاق پیپلز پارٹی کے پاس ہی نہیں سارا "اتفاق" نواز شریف صاحب کا ہے ان کی

دیکھا دیکھی اور ارکان بھی شعر انگیزیوں پر اتر آئے تو اسمبلی ہال کا حال مشاعرہ گاہ جیسا ہو گا۔

بنگال میں ایک بار اسمبلی میں مشاعرہ کرنے پر ڈپٹی سپیکر کی چھٹی ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے ربانی صاحب یہ شعر انہیں مقاصد کے لیے یاد کر رہے ہوں اور ممکن ہے کئی شاعر اپنے دیوان لے کر ان کے پاس پہنچ بھی گئے ہوں۔ ایک ایسا شاعر کسی وزیر کے گھر پہنچا تو سی آئی ڈی والے کو خبر ہوئی کہ وہ شخص بم لے کر اندر جا رہا ہے۔ خفیہ پولیس کے جوانوں نے اسے فوراً دبوچ لیا اور کہا: "تمہارے پاس بم ہے۔" وہ بولا: "صرف بم نہیں۔" پوچھا: "اور کیا ہے ساتھ؟" تو وہ بولا: "قبلہ! زیر و بم' میری شاعری کا مجموعہ ہے' وزیر صاحب کو پیش کرنے جا رہا ہوں۔" بہرحال شعر یاد کرنے سے مشکل مرحلہ یہ ہے کہ کون سا شعر یاد کیا جائے۔ ایک شاعر کسی مقرر کے پاس اپنے چھ شعر لے کر گیا کہ ان میں سے ایک منتخب کر کے تقریر میں استعمال کر لیں۔ مقرر نے پانچ شعر سنے اور کہا: "چھٹا سب سے بہتر ہے۔" شاعر نے کہا لیکن آپ نے تو چھٹا سنا ہی نہیں۔" تو اس نے کہا: "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں چھٹا بہتر ہے۔"

بہرحال اسمبلی میں اتنا تو ہو گا کہ ہر شخص بڑے ادب سے اسپیکر کو کہے گا کہ جناب اسپیکر عرض کیا ہے! کسی مسئلہ پر بڑی گرما گرمی ہوئی سننے والے کو یہی لگے گا کہ آغا حشر کاشمیری کے کسی ڈرامے کا حشر ہو رہا ہے۔ اس حساب سے تو اسمبلی کی سالانہ رپورٹ بھی شاعری کی کتاب پر مشتمل ہو گی جس میں مقرر کی بجائے مکرر لکھا ہو گا۔ اب ایوان کا اس پر استحقاق مجروح ہوتا ہے کہ فلا رکن نے اخلاق سے گری بات کی ہے۔ تب یہ ہو گا کہ معزز رکن نے وزن سے گرا شعر اور اسے اسمبلی کی کارروائی سے حذف کرنے کی اپیل کی جائے گی۔ ہو سکتا ہے اگلی غزل تک تحریک التواء پیش کر دی جائے اور ممکن ہے ایک دن یہ خبر چھپے کہ اپوزیشن نے اسمبلی کے اجلاس سے واک آؤٹ کر دیا جس کی وجہ یہ تھی کہ حزب اقتدار نے اپنے شعر تو

سنا دیئے مگر اپوزیشن کے نہیں سنے۔

○○○

• اشتہار برائے تلاش کولمبس

صاحب! ہم ایسے ہی امریکیوں کو احسان فراموش سمجھتے رہے۔ آج سے پانچ سو سال قبل کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا' لیکن امریکی آج تک یہ نہیں بھولے اور پانچ سو سال بعد انہوں نے کولمبس کی "تلاش" شروع کر دی ہے اور اعلان کیا کہ 1992ء میں امریکہ کی پانچ سو سالہ تقریبات تک ہر حالت میں کولمبس کی دریافت کر لیں گے' کیونکہ ابھی تک کوئی نہیں جانتا کہ کولمبس کس ساحل پر اترا' اس کی شکل و صورت کیسی تھی۔ شکل و صورت تھی بھی یا نہیں۔ ویسے ہم امریکیوں کے اس لحاظ سے معترف ہیں کہ انہوں نے یہ دریافت کر کے وہ کام کیا ہے کہ خدا اسے جہنم میں نہیں بھیجے گا' دوبارہ امریکہ بھیج دے گا۔ کولمبس سے پہلے امریکہ میں لوگ رہتے تو تھے مگر انہیں یہ پتا نہیں تھا کہ وہ امریکہ میں رہتے ہیں سو بڑے آرام سے رہتے تھے۔ امریکہ کا مطلب ڈکشنری میں نیوورلڈ ہے جس سے اور کچھ سمجھ میں نہ آئے نیو ورلڈ آرڈر کا مطلب سمجھ میں آ جاتا ہے۔

ایک بندہ بتا رہا تھا کہ میرا دادا آئرش ہے' میری دادی سویڈش ہے' ایک ماموں پولش' خالہ فرانسیسی جبکہ والدہ اٹلی میں پیدا ہوئیں تو دوسرے نے پوچھا "مگر تم کون ہو؟" تو وہ بولا "میں امریکی ہوں۔" جہاں تک ان کی زبان کا تعلق ہے پاکستانیوں سے زیادہ کون جانتا ہے کہ ان کی کوئی زبان نہیں۔ ایک امریکی صحیح انگریزی بول رہا تھا تو دوسرے نے کہا "کیا غیر ملکی ہو؟" تو اس نے کہا "میں تو غیر ملکی نہیں' میرا انگلش ٹیچر غیر ملکی ہے۔" ماحول ایسا کہ ہمارے ہاں دس برس میں بچے جتنے بڑے ہوتے ہیں وہاں دس منٹ میں ہو جاتے ہیں۔ ایک بچے نے دوسرے سے پوچھا "تمہاری عمر کیا ہے؟" اس نے کہا "ٹھیک سے یاد نہیں چار سال یا پانچ سال!" تو پہلے بچے نے کہا "لڑکیوں کے ساتھ گھومتے ہو؟" تو وہ بولا "نہیں تو!" پہلے نے کہا "پھر تم چار سال کے ہو۔" امریکہ

میں ہر چیز اصلی ملتی ہے' سوائے باپوں کے۔ حالیہ سروے رپورٹ کے مطابق ہر دس باپوں میں سے ایک اپنی اولاد کا اصلی باپ نہیں ہوتا۔ وقت کی اتنی قدر کرتے ہیں کہ

اداکارہ ساتھی ہیرو کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ پر جا رہی تھی کہ راستے میں کار خراب ہو گئی۔ پتا چلا ایک گھنٹہ لگے گا تو دونوں سوچنے لگے اس ایک گھنٹے میں کیا کیا جائے اور دونوں نے شادی کر لی۔ وہاں ہوٹلوں میں سیلف سروس ہے۔ ہمارے ہاں دفتروں میں سیلف سروس ہے۔ کسی دانشور نے کہا ہے کہ امریکی وہ لوگ ہیں جنہیں یہ بے شک پتا نہ ہو کہ کدھر جا رہے ہیں' لیکن انہوں نے یہ تہیہ کیا ہوتا ہے کہ ان کی سپیڈ سب سے تیز ہو گی۔ امریکہ کے ایک فوجی کیمپ کے قریب ایک شخص گھومتا ہوا پکڑا گیا۔ پوچھ گچھ کے لیے کمانڈنگ افسر کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے پوچھا

"تم غیر ملکی ہو یا امریکی؟"

"امریکی۔"

"اچھا تو ذرا اپنا قومی ترانہ سناؤ۔"

اس شخص نے شرمندہ ہو کر اعتراف کیا کہ وہ تو مجھے نہیں آتا۔ امریکی کمانڈنگ افسر نے کہا "تم جا سکتے ہو! مجھے یقین ہے کہ تم امریکی ہی ہو۔"

ایک پاکستانی بتاتا ہے کہ ایک امریکی نے بیوی پر بدچلنی کا الزام لگا کر عدالت میں طلاق کا دعویٰ دائر کر دیا اور کہا کہ میری بیوی نے میرے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ جب گزشتہ ہفتے میں اپنے گھر آیا تو بیوی گھر میں ایک اجنبی مرد کے ساتھ تھی۔ بیوی نے کہا "جناب دھوکہ تو اس نے مجھے دیا ہے' جاتے ہوئے مجھے یہ بتا کر گیا تھا کہ چار روز بعد آؤں گا اور دوسرے دن ہی آ گیا۔" یوں خاوند کو عدالت نے دھوکہ دہی سے کیس میں جرمانہ کر دیا۔

آئن سٹائن ہاورڈ میں مہمان خصوصی تھا۔ ڈین نے پوچھا کہ سمجھ نہیں آتی جرمن وہ قوم ہے جو سائنس اور آرٹ کی سرخیل رہی' مگر اس نے نازی کا فلسفہ کیسے قبول کر لیا؟ آئن سٹائن نے کہا کہ جرمنوں میں تین خوبیاں ہیں: ایمانداری' ذہانت اور نازی ازم۔

لیکن ایک جرمن میں بیک وقت ان میں سے دو ہی ہو سکتی ہیں' اس لیے ایک جرمن جو ایماندار اور نازی بھی ہے' وہ ذہین نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ذہین نازی ہے تو ایماندار نہیں ہو سکتا اور اگر وہ ایماندار اور ذہین ہے تو وہ نازی نہیں ہو سکتا۔ کچھ ایسے ہی خیالات امریکیوں کے بارے میں مارک ٹوئن کے بھی ہیں۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں "ہم امریکی' ڈالر رب العزت کی عبادت کرتے ہیں۔"

آج کل امریکیوں نے کولمبس کو "براعظم کا قاتل" کا خطاب بھی دے دیا ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد نے کولمبس کو خوش آمدید کہا اور اس نے انہیں غلام بنا کر ان کی دنیا ختم کر کے "نیوز ورلڈ" بنائی۔ لیکن ابن انشاء نے لکھا ہے "امریکیوں کی دریافت دراصل کولمبس نے غلطی سے کی' وہ ہندوستان یعنی ہمیں دریافت کرنا چاہتا تھا۔ اس نظریے کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ چونکہ ہم ابھی تک دریافت نہیں ہوئے۔" ویسے یہ پرانی رائے ہے ورنہ ہم تو اب خود کولمبس دریافت کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ یوں تو امریکہ تو کبھی آڑے وقت میں ہمارے کام نہیں آیا' لیکن ہم اس گھڑی اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ وہ ہماری پولیس کو صرف ایک ہفتہ دے دے وہ نہ صرف "مبینہ" کولمبس کو دریافت کر لے گی بلکہ وہ اپنی زبان سے اقرار کرے گا کہ اس نے ہی امریکہ دریافت کیا تھا۔ ویسے امریکہ صرف یہ بتا دے کہ اسے بچہ کولمبس دریافت کرنا ہے' جوان یا بوڑھا؟

○○○

• شناخت پریڈ

صاحب! آج کل ڈاکٹروں کے پاس جتنی تصویریں وزیر صحت جعفر اقبال صاحب کی ہیں شاید کسی فلمی اداکارہ کی نہ ہوں۔ یہی نہیں آج کل جو بھی مریض آؤٹ ڈور یا ایمرجنسی وارڈ میں آتا ہے ڈاکٹر اس کے معائینے کے لیے جیب سے اسٹیتھو سکوپ بعد میں نکالتے ہیں پہلے تصویر نکال کر چیک کرتے ہیں اور پھر ساتھی ڈاکٹر کو تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں "وزیر صحت نہیں اصلی مریض ہے۔" اب تو دوسرے ڈاکٹر کو بتانا ہو کہ مریض Functional ہے تو کہتے ہیں "یہ وزیر صحت ہے۔" گائنی وارڈ کے ڈاکٹر بھی احتیاطاً اپنے مریضوں کو تصویر سے ٹیلی کر لیتے ہیں۔ بیرے تو کسی نئے آنے والے کو سلام کہیں اور وہ جواب نہ دے تو بھاگ کر ڈاکٹر کو جا کر اطلاع دیتے ہیں "سر! تیار ہو جائیں جو بندہ آ رہا ہے' مجھے اس کے وزیر ہونے کا شک ہے۔" ذہنی امراض کے وارڈوں میں تصویر بہت ضروری ہو گئی ہے کیونکہ یہاں تو داخل ہونے والے اکثر خود کو وزیر یا بادشاہ ظاہر کرتے ہیں۔ یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ کچھ دن قبل وزیر صحت مریض بن کر سروسز ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں گئے اور کہا "میرے گلے میں کچھ پھنس گیا ہے۔" قیاس ہے خبر پھنسی ہو گی۔ ڈاکٹر ابتدائی معائینے کے بعد انہیں آپریشن تھیٹر میں شفٹ کرنے ہی لگے تھے کہ ایک صحافی نے پہچان لیا ورنہ ان کے ساتھ بھی وہی ہوتا جو مسز شیری کے ساتھ ہوا۔ امریکہ کے این ای ٹی کے اسپشلسٹ سے دوسرے ڈاکٹر نے پوچھا:

"ڈاکٹر صاحب آپ نے مسز شیری کا آپریشن کیوں کیا؟"

"ایک ہزار ڈالر۔"

"ڈاکٹر صاحب' آپ میرا سوال نہیں سمجھے' میرا مطلب ہے آپریشن کی علامات؟"

جواب ملا: "ایک ہزار ڈالر۔"

بہرحال اس دن تو وہ ڈاکٹروں کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر چلے گئے' اگرچہ پتا نہیں چلا کہ حسن سلوک میں حسن سے کتنا اور سلوک سے کتنا متاثر ہوئے' لیکن اس دن سے ڈاکٹروں کو ہر دوسرا شخص وزیر صحت نظر آنے لگا ہے۔

ہو سکتا ہے آپ کہیں جعفر اقبال صاحب آخر گلا دکھانے ہی کیوں گئے' آنکھیں دکھانے بھی جا سکتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے انہیں دیکھا نہیں' وہ تو پورا منہ کھولیں تو ڈاکٹر کہتے "سر! میں باہر کھڑا ہو کر ہی معائنہ کروں گا۔" اگرچہ ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں کہ ایک پینٹر نے اپنی پینٹنگ اپنے ڈاکٹر دوست کو دکھاتے ہوئے کہا "آپ کی اس پینٹنگ کے بارے میں کیا رائے ہے؟" تو اس نے کہا "میری رائے کے مطابق تو نمونیئے کا مریض ہے۔" اس لیے وزیر صحت بغیر کسی مرض کے بھی چلے آتے تو ڈاکٹر خود تلاش کر لیتے۔ ایک شخص لو میرج کے بعد بیوی کو آئی سپشلسٹ کے پاس لے گیا کہ محترمہ کی نظر کمزور ہے۔ ڈاکٹر نے سمارٹ شخص کے ساتھ نوبیاہتا بھدی بیوی دیکھی۔ پھر ڈراپس لکھ کر دے دیے۔ اس شخص نے پوچھا "بیگم یہ دوائی کب کب آنکھوں میں ڈالے؟" تو ڈاکٹر نے کہا "خاتون کی آنکھیں ٹھیک ہیں یہ دوائی آپ کے لیے ہے؟" ایک ایسے ہی مریض کو ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہیں کوئی بہت پرانی بیماری لگی ہے جس وجہ سے تمہاری صحت روز بروز گر رہی ہے۔ تو مریض نے کہا "ڈاکٹر صاحب! آہستہ بولیں وہ ساتھ والے کمرے میں بیٹھی ہے۔"

لیکن اس واقعے سے تو لگتا ہے جعفر اقبال صاحب کو بچپن ہی سے اداکاری کا شوق ہے۔ اداکار وہ ہوتا ہے جو ادا سے کار ہی نہ خرید لے بلکہ ہر کار ادا سے کرے۔ ہر کامیاب سیاست دان دراصل کامیاب اداکار ہی ہوتا ہے۔ بلکہ ان کا یہ شوق پورا کرنے کے لیے خصوصی ٹی وی پروگرام "خبرنامہ" ہوتا ہے تاکہ ان کو پرفارمنس کا موقع ملتا رہے لیکن اس میں مرکزی رول والے ہی چھائے ہوئے ہیں۔ جعفر اقبال صاحب تو سپورٹنگ ایکٹر ہیں' سو انہیں یہ شوق ایسے ہی پورا کرنا پڑا۔ ویسے تو وزیر کا رول بھی بڑا مشکل

ہوتا ہے' کسی نے ریگن سے پوچھا "آپ نے کئی رول کئے' آپ کو سب سے مشکل کونسا لگا اور کیوں؟" تو ریگن نے کہا "امریکی صدر کا رول مجھے سب سے مشکل لگا' کیونکہ اس میں ایکٹر اور ڈائریکٹر میں خود ہی تھا۔ ڈائیلاگ سیکرٹری لکھ دیتے تھے مگر ریہرسل کا وقت نہ ملتا تھا۔" لیکن ہمیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ جعفر اقبال صاحب نے اداکاری ہی کرنا تھی تو اس کے لیے انہیں مریض کا رول ہی کیوں پسند آیا؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس رول کے لیے انہیں کسی گٹ اپ کی ضرورت نہیں تھی یا اس کی پہلے سے ریہرسل تھی۔ جیسے ایک اداکار کو ڈرامہ سیریل میں جھوٹ بولنے والے شخص کا رول ملا تو کسی نے پوچھا "یہ کردار کرتے ہوئے آپ کو اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی؟" تو اس نے کہا "بالکل نہیں میں کئی سال پی ٹی وی پر خبریں پڑھتا رہا ہوں۔"

ہماری اردو شاعری میں تو عاشق ہمیشہ اس لیے بیمار ہوتا ہے کہ مسیحا سے ملاقات کا بہانہ بنے۔ جعفر اقبال صاحب روایتی آدمی ہیں انہیں پتا ہے ڈاکٹر دنیا کا واحد شخص ہے جسے تندرست آدمی اچھے نہیں لگتے۔ سو انہوں نے مسیحاؤں سے ملاقات کے لیے اردو شاعری والا روایتی طریقہ استعمال کیا۔ لیکن مسیحاؤں کو انہیں مریض کے روپ میں دیکھ کر بھی خوشی نہیں ہوئی بلکہ ہر مریض سے ڈرتے پھر رہے ہیں کہ کہیں وہ وزیر صحت نہ نکل آئے۔

○○○

• غلام دستگیر پہلوان

گوجرانوالہ ایسا شہر ہے جہاں جو کبھی اکھاڑے نہیں گیا یا اکھاڑے سے نہیں گزرا' وہ بڑا گیا گزرا سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ہر محلے کا اپنا اکھاڑہ نہیں ہر اکھاڑے کا اپنا محلّہ ہوتا ہے۔

اہل گوجرانوالہ کسی بہادر اور زور آور کی تعریف کرنا چاہیں تو اسے پہلوان کہتے ہیں اور اگر کسی کمزور اور بزدل کا مذاق اڑانا ہو تو اسے بھی پہلوان ہی کہتے ہیں۔ لیکن نواز شریف صاحب نے اپنے دورہ گوجرانولہ میں خان غلام دستگیر کو پہلوان قرار دے دیا۔ اگرچہ وہ بچپن میں صرف ایک بار اکھاڑے میں کشتی کے لیے نکلے' تب سے نکلے ہوئے ہیں' پھر اکھاڑے نہیں گئے۔ مگر سیاسی اکھاڑے میں غلام دستگیر پہلوان سابقہ پٹھہ ضیاء الحق پہلوان حالیہ پٹھہ نوازشریف پہلوان کا بڑا مقام ہے۔ ان کا ویسے ہی ڈیل ڈول اتنا ہے کہ بیٹھنے کے لیے بھی بڑا مقام بلکہ بہت بڑا مقام چاہیے ہوتا ہے۔

خان صاحب کی تعلیم تو اتنی ہی ہے کہ وزیر تعلیم ہی لگ سکتے ہیں۔ میٹرک میں ان کا نتیجہ دیکھ کر والد صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ بیٹا بڑا ہو کر سیاستدان بنے گا۔ نواب آف کالا باغ کے دور میں سیاست کا سبز باغ دیکھا۔ لیبر منسٹر بھی رہے' ایسے کامیاب کہ لیبر میں لیبر ہوتے اور منسٹروں میں منسٹر۔ ایسے ہی ایک لیبر منسٹر نے تقریر کرتے ہوئے کہا "میں ایک دن لیبر پین یعنی لیبر کے درد ختم کر کے رہوں گا۔" مقرر تو خان صاحب بھی ایسے ہیں کہ تقریر کر رہے ہوں تو بھول جاتے ہیں کہ وہ کس موضوع پر تقریر کر رہے ہیں۔ موضوع یاد ہو تو یہ بھول جائیں گے کہ تقریر کر رہے ہیں۔ ایک بار ٹرسٹ پلازہ گوجرانوالہ کی افتتاحی تقریب سے خطاب فرما رہے تھے' کہا "میرے سامنے گوجرانوالہ بنا' شروع میں 75 لاکھ لوگ آباد تھے۔" پیچھے سے کسی نے لقمہ دیا کہ جناب 75 ہزار ہوں گے تو دوران تقریب ہی پیچھے مڑ کر کہا "ابا جی نے تو اتنے ہی بتائے

تھے' ویسے 75 کا مجھے پکا پتا ہے' 75 ہزار ہوں گے یا 75 لاکھ۔ ان کے گھر کے سامنے سینٹ جوزف ہائی سکول ہے' وہاں ایک تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ ساری تقریر اردو میں کی مگر آخر میں تھینک یو انگریزی میں کہا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولے "دوسرے یہ نہ سمجھیں کہ مجھے انگریزی نہیں آتی۔" تقریر میں فرمایا کہ مجھے پہلی بار سکول آ کر بڑی خوشی ہوئی ہے' پھر اس سکول سے میرے بچوں نے میٹرک سے لے کر نرسری تک تعلیم حاصل کی ہے۔ کسی نے کہا "میٹرک سے نرسری تک؟" تو بولے "بس ذرا ترتیب غلط ہو گئی۔" ایسے ہی ایک میڈیکل سٹوڈنٹ کو ٹیچر فیملی ہسٹری لینا بتا رہا تھا کہ پہلے شادی کا پوچھو؟ پھر بچوں کی تعداد؟ سٹوڈنٹ ہسٹری لے کر آیا تو سر پھٹا ہوا تھا۔ ٹیچر نے پوچھا "کیا ہوا؟" بولا "ذرا ترتیب غلط ہو گئی۔ میں نے پہلے خاتون سے پوچھا "آپ کے کتنے بچے ہیں؟" اس نے کہا "تین۔" تو میں نے پوچھا "آپ کی شادی ہوئی ہے؟" ایک بار خان صاحب کی بیوی کا دل کے ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور کہا بائی پاس ضروری ہے تو خان صاحب نے کہا واقعی بائی پاس آج کل بہت ضروری ہے۔ دیکھیں ناں! گوجرانوالہ بائی پاس کی وجہ سے شہر کے حالات کتنے بہتر ہو گئے۔ انہی دنوں بیوی انتہائی نگہداشت وارڈ میں داخل تھی مگر شہر میں جو پوچھتا اسے کہتے انتہائی نگہداشت وارڈ میں ہے۔ ایک بار کسی نے کہا "آپ کے مخالفین بھاگ کھڑے ہوئے" تو بولے "ایک بات کرو' بھاگے یا کھڑے ہوئے۔" سیٹیزن کو ٹی زن کہتے ہیں۔

جیسے سکھا شاہی دور میں لاہور کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص صاف کپڑے پہن کر شہر میں پھرتا نظر آتا تو فوراً پتہ چل جاتا کہ یہ لاہور میں اجنبی ہے۔ ایسے ہی گوجرانوالہ میں جو پہلوان نظر نہ آئے وہاں کے لوگ اسے کسی اور شہر کا سمجھتے ہیں۔ اسی لیے الیکشن میں امیدواروں کے بورڈ شہر میں یوں لگے ہوتے ہیں کہ لگتا ہے الیکشن نہیں ہو رہا' دنگل ہو رہا ہے۔ ایک ایسا پہلوان کنویسنگ کے لیے کسی کے گھر گیا تو اہل خانہ نے بیٹھک کا دروازہ کھول کر کہا "پہلوان جی بیٹھ جائیں۔" پہلوان نے یہ سنا اور مارنا

شروع کر دیا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا "یہ مخالف پارٹی کا بندہ ہے' مجھے کہہ رہا ہے آ بیٹھ جائیں' الیکشن پر اتنا خرچہ کر کے اس کے کہنے پر بیٹھ جاؤں۔" گوجرانوالہ والے کھانے کے اس قدر شوقین ہیں کہ کار کی بھی تعریف یوں کریں گے:

"بھا جی بڑی مزیدار گڈی اے۔"

اس لحاظ سے تو خان غلام دستگیر خان صاحب واقعی پہلوان ہیں۔ ایک بار وزن کرنے لگے تو سوئی آخر ہندسوں کی طرف بھاگی تو سوچا اس مشین پر ایک وقت میں سارا وزن نہیں ڈالنا چاہیے' سو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر وزن کیا۔ اگرچہ یہ پتا نہیں چلا کہ نواز شریف صاحب نے انہیں پہلوان کیوں کہا ہے؟ بہرحال یہ ضرور ہے کہ گوجرانوالہ میں کوئی بھی بڑی شخصیت آئے گوجرانوالیے اس سے محبت کا اظہار پہلوان کا لقب دے کر ہی کرتے ہیں۔ جنرل ضیاء الحق گوجرانوالہ گئے تو حامیوں نے انہیں ضیاء پہلوان کہا اور مخالفین نے ضیاع پہلوان۔ اب نواز شریف صاحب گوجرانوالہ گئے تو وہاں نواز شریف پہلوان کے بورڈ نظر آئے۔ اگرچہ نواز شریف صاحب کا خاندانی پس منظر ایسا ہے کہ وہ اکھاڑے چلے جائیں تو انہیں لگتا ہے سسرال میں آ گئے۔ لیکن انہوں نے فوراً جواباً غلام دستگیر خان کو پہلوان کہہ کر حساب برابر کر دیا۔ ایسے ہی جیسے ایک تقریب میں احمد ندیم قاسمی صاحب سے کسی نے کہہ دیا کہ آپ ہمارے بزرگ ہیں' تو قاسمی صاحب نے فوراً کہا "تم خود ہی ہو گے۔"



• صرف بالغوں کے لیے

صاحب! کچھ لوگوں کے نام ہی کامیابی کی ضمانت ہوتے ہیں۔ جیسے ایک اداکار نے بتایا کہ میں نے ایک فلم میں کام کیا اور وہ ہٹ ہو گئی' دوسری فلم میں' میں نے کام نہیں کیا مگر وہ صرف میرے نام کی وجہ سے سپر ہٹ ہو گئی۔ پوچھا کیسے؟ بولے "فلم کے اشتہاروں میں انہوں نے میرا نام بڑا کر کے لکھا کہ اس فلم میں یہ اداکار نہیں ہے۔" کچھ یہی حال منسٹر شیخ رشید صاحب کا بھی ہے۔ وہ لوگ جو کہا کرتے تھے "ٹی وی پر 9 بجے سے پہلے پروگرام دیکھنے والوں سے ٹیکس لینا چاہیے اور 9 بجے کے بعد کے پروگرام دیکھنے والوں کو ٹیکس دینا چاہیے۔" اب وہی لوگ نو بجے کے بعد اسمبلی کی کارروائی کا ذکر سنتے ہی چھوٹے بچوں کو بہانے سے دوسرے کمرے میں بھیج کر ٹی وی کے سامنے یوں بیٹھ جاتے ہیں کہ آنکھ نہیں جھپکتے' کہیں شیخ رشید صاحب والا سین نہ گزر جائے۔ یہی نہیں مولانا اجمل خان صاحب نے جنہوں نے آج تک فلم کو تسلیم نہیں کیا' شیخ صاحب کو فلمی ہیرو تسلیم کر لیا ہے۔ ویسے اسمبلی کی پچھلی قسط میں انہوں نے کریکٹر ایکٹر مصطفیٰ غیر قریشی صاحب کے مقابلے میں جو پرفارمنس دی ہے' اس نے غلام مصطفیٰ غیر قریشی کی جوانی یاد کرا دی۔ اگرچہ مصطفیٰ غیر قریشی صاحب نے انہیں "نواں آیاایں سوہنیا" تو نہیں کہا مگر شیخ صاحب ان کی نسبت اس انڈسٹری میں نئے ہیں۔ چونکہ "شیخ" ہیں اس لیے فلم انڈسٹری کے "نصف بہتری" کے لیے یہ نام اجنبی نہیں۔ مصطفیٰ غیر قریشی صاحب خاوند کا جتنا اچھا اور بار بار رول کرتے ہیں' وہ تو خیر شیخ صاحب کے بس کی بات نہیں۔ ویسے بھی ایک اداکار کو کسی ہدایت کار نے کہا "کل آ جانا' ایک خاوند کا رول ہے۔" تو اداکار نے معذرت کرتے ہوئے کہا "سوری! میں خاموش رول نہیں کروں گا۔" سو اب تک شیخ رشید صاحب یہ رول شاید اس لیے نہیں کر سکے

کہ وہ خاموش نہیں ہو سکے۔ اگر وہ چپ ہوں تو یقین کر لیں کہ ان کے منہ میں سگار ہے۔ اس لیے ان کے دوست انہیں اکثر تحفے میں سگار ہی دیتے ہیں۔ شیخ صاحب بڑے بڑے اجتماعات میں یوں خطاب کرتے ہیں کہ ہر کوئی سمجھتا ہے' صرف مجھ سے مخاطب ہیں۔ اس پر میرے ایک جاننے والے نے کہا "یہ کون سی بڑی بات ہے' جب میں مینار پاکستان میں ہزاروں کے مجمع سے خطاب کرتا ہوں تو ہر کوئی سمجھتا ہے جیسے میں اسے کہہ رہا ہوں۔" پوچھا "تم کیا کہتے ہو؟" بولا میں کہتا ہوں:

"دال گرم' مونگ پھلی' ریوڑیاں لے لو۔"

یہی نہیں کرکٹر ایکٹر مصطفیٰ غیر قریشی نے بھی شیخ رشید صاحب کی اداکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ صرف 1500 روپے میں شٹل کاک برقع پہن کر مجھے ملنے آیا کرتے جس کی بظاہر وجہ تو یہی لگتی ہے کہ مصطفیٰ غیر قریشی کو ملنے کے لیے یہ روپ ضروری ہے۔ ان کے تو کان ہی ایسے ہیں کہ مردانہ آواز صاف سنائی نہیں دیتی لیکن اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شیخ صاحب شروع ہی سے ہر قسم کے رول کر لیا کرتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جس طرح شروع میں بیگم عابدہ حسین پردے کی پابند تھیں اور انہوں نے اسمبلی میں آ کر شٹل کاک برقع چھوڑ دیا' شیخ صاحب نے بھی چھوڑ دیا ہو البتہ جہاں تک 1500 روپے کا تعلق ہے' اس پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ جیسے ہماری ایک اداکارہ پر کسی نے الزم لگایا کہ اس نے ایک پشتو فلم میں تین ہزار لے کر قابل اعتراض گیت ریکارڈ کرایا ہے تو اس نے اگلے روز ہی پر زور تردید کی کہ یہ میری ساکھ کو نقصان پہنچانے کی سازش ہے۔ پہلی بات تو یہ غلط ہے کہ میں نے ایسا کوئی گیت ریکارڈ کروایا ہے اور پھر یہ بھی سراسر غلط ہے کہ میں نے تین ہزار روپے لیے ہیں' میں تو دس ہزار سے پائی کم نہیں لیتی۔

اسمبلی کی اس قسط میں معلومات' انکشافات' سپنس' سیکس' مزاح' طنز' رومان اور ایکشن وہ سب کچھ تھا جو کسی بھی سپرہٹ فلم میں ہو سکتا ہے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ یہ

فلم جوں کی توں ریلیز ہو کر پلاسیم جوبلی کرے گی مگر یہ بھی سنسر والوں کی زد سے نہ بچ سکی۔ گوہر ایوب خان نے اسے چار رکنی سنسر کمیٹی کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ سنسر بورڈ والوں سے ہماری کبھی نہیں بنی کیونکہ وہ ہمیشہ ' وہ سب کچھ دیکھ جاتے ہیں جو ہم نے دیکھنا ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے جو سلطان راہی کی ایک فلم کے ساتھ ہوا۔ فلم میں موصوف رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر گنڈاسا لیے ہر کسی کو قتل کیے جا رہے ہیں تو سنسر بورڈ کے ممبر اصغر ندیم سید نے کہا کہ "حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اس طرح استعمال نہیں ہونا چاہیے' اسے فلم سے نکال دیں جبکہ دوسرے رکن نے پوری فلم دیکھنے کے بعد کہا' حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا نام رہنے دیں باقی ساری فلم نکال دیں۔" یوں جب 1963ء جان پروفیو نے کرسٹن کیلر کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں جھوٹ بولا تو کسی نے کہا "اسمبلی میں سب سے فحش اور ننگی بات جھوٹ بولنا ہے۔" سو گوہر ایوب خان کی سنسر کمیٹی نے کارروائی سے ساری ننگی باتیں نکال دیں تو صرف ارکان اسمبلی کے نام ہی رہ جائیں گے۔ شاید وہ بھی نہ رہیں کیونکہ غنڈہ' سانڈ' برگر فیملی' لوہا گروپ' اختر کھسرا' لونگ گواچا وزیر اور این پی پی عائشہ گروپ سب نام سنسر ہو جائیں گے۔ یوں ہوتے ہوتے سب صاف ہو جائے گا۔ شاید اسی بہانے گوہر ایوب صاحب اسمبلی کا ریکارڈ صاف رکھنا چاہتے ہوں حالانکہ وہ ایسے بھی کر سکتے تھے۔ جیسے ہم غیر ملکی فلمیں سنسر کرتے ہیں یعنی ان پر "صرف بالغوں کے لیے" لکھ کر جوں کا توں ریلیز کر دیتے ہیں جس سے شیخ صاحب کی انڈسٹری یعنی فلم انڈسٹری کو بڑا فائدہ ہو گا۔ وہ سینما ہال جو فلاپ فلموں کے ساتھ یہ اشتہار دیتے ہیں کہ "گرما گرم سائیڈ پروگرام" یہ اشتہار دے کر زیادہ سے زیادہ رش لیتے کہ گرما گرم اسمبلی پروگرام اور پھر اس صورت میں چھاپے کا بھی ڈر نہ رہتا۔ یہی نہیں بچوں کے سونے کے بعد اسے لیٹ نائٹ سروس کے طور پر دکھا کر لاکھوں نوجوانوں کو خوش کیا جا سکتا ہے۔ اسے کتابی شکل میں چھاپا جا سکتا ہے؟ وول راجہ کہتا ہے کہ

میں لطیفے بیان نہیں کرتا' صرف اسمبلی کی کارروائی لکھتا ہوں جو کہ جوں کی توں ہوتی ہے۔ مزید کہتا ہے کہ اس کارروائی کو کتابی صورت میں چھپنا چاہیے کیونکہ بالغوں کے لطیفوں کی کتابیں "بیسٹ سیلر" ہوتی ہیں۔

○○○

• شاعروں کی برتھ کنٹرول

طاہر مسعود کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں شاعروں کی سالانہ پیداوار ٹماٹروں کی سالانہ پیداوار سے کہیں زیادہ ہے۔ بظاہر تو ان دو اجناس میں کوئی تعلق نہیں' ہاں کبھی مشاعروں پر کچھ تعلق قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ سچ ہے کہ ہم شاعروں کے معاملے میں اس قدر خود کفیل ہو گئے ہیں کہ اب تو ہم نے انہیں برآمد کر کے زرمبادلہ کمانا شروع کر دیا ہے۔ ہمارے معروف شاعر عطاالحق قاسمی اور حسن رضوی تو اب پاکستان کے دورے پر تب ہی آتے ہیں جب یہاں کوئی مشاعرہ ہو۔ اجمل نیازی صاحب بھی کسی سے کم نہیں۔ ہم سے کوئی بچہ شاعر دیکھنے کی ضد کرے تو ہم اسے اجمل نیازی صاحب دکھاتے ہیں لیکن پچھلے دنوں انہوں نے اداکار محمد علی کی طرف سے بین الاقوامی اردو کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں ابتدائی میٹنگ میں جس میں تمام بڑے دانشور' ادیب اور شاعر اکٹھے تھے' یہ فرما کر سب کو حیران کر دیا کہ مشاعرہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے رقم اور راقم برباد ہوتا ہے۔ اگرچہ اجمل نیازی صاحب کا تعلق شروع سے ہی مشاعرہ لوٹنے والے گروہ سے رہا ہے۔ ہم نے خود انہیں مشاعرہ لوٹتے دیکھا ہے۔ ان کی بات غیر شرعی ہو جائے مگر غیر شعری نہیں ہوتی۔ جیسے جگر مراد آبادی کے پاس ایک دوست اپنے قانونی وثیقے پر بطور گواہ دستخط کروانے آیا مگر جگر صاحب نے سارا قانونی وثیقہ پڑھا اور اس میں سے دو غیر شاعرانہ الفاظ نکالنے پر اصرار کیا' پھر اس پر دستخط کیے۔ اجمل نیازی صاحب کی ہر حرکت ادب کے دائرے میں آتی ہے۔ وہ جب ویگنوں میں بہت سفر کرتے تو ہم یہی سمجھتے رہے کہ یہ بھی شاعری کو فروغ دینے کے لیے ہے کیونکہ چلتی ویگن سے بہتر جگہ شاعر کے لیے ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ سننے والے کے بھاگنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ضرور ان کی یہ بات بھی ادب اور شاعری کی بھلائی کے لیے ہو

گی!

شاعر پیدائشی ہوتے ہیں اور یہی مسئلہ ہے۔ شاعروں کی افزائش نسل کے لیے مشاعرے کھاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان پر پابندی دراصل شاعروں کی برتھ کنٹرول ہے۔ بین الاقوامی اردو کانفرنس کی میٹنگ میں بشریٰ رحمٰن صاحبہ نے شاعروں کی بہبود آبادی کا ذکر تو کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اجمل نیازی صاحب نے اسے محکمہ بہبود آبادی سمجھ کر یہ تجویز دے دی ہو لیکن اس کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ مشہور شاعر فرخی کو بادشاہ وقت نے اس کا کلام سن کا انعام میں مویشیوں کا گلہ دے دیا اور وہ سارا دن یہ انعام سمیٹتے رہے۔ پھر انھوں نے کبھی غزل نہ کہی۔ یہی نہیں بادشاہ شاعروں کو منہ اسی لیے موتیوں سے بھرنے کا حکم دیتے کہ یہ اگلا شعر نہ سنائیں۔ خلعت فاخرہ بھی ملتی' جسے شاعر سنبھالتے ہی رہتے۔ ویسے اجمل نیازی صاحب ان شاعروں میں سے ہیں جنہیں خلعت فاخرہ دی بھی گئی تو وہ خلعت تو واپس کر دیں گے البتہ فاخرہ کا پکا پتہ نہیں۔

غزل کا مطلب' تنہائی میں عورتوں سے باتیں کرنا ہے اور اس حساب سے کون شخص ہے جس نے کبھی غزل نہ کہی ہو۔ اس حساب سے تو غلام مصطفیٰ کھر ملک کے سب سے بڑے غزل گو ہیں جو نئی نئی زمینوں میں غزلیں کہہ رہے ہیں۔ پھر صاحب دیوان بھی ہیں' ان کے دیوان خانے سے بڑا دیوان خانہ کس شاعر کا ہو گا؟ مشاعروں میں غزل سنانا دراصل عورتوں سے تنہائی میں کی گئی باتیں سر عام کرنا ہے۔ شاید اسی لیے اجمل نیازی صاحب مشاعروں کے مخالف ہیں کہ تنہائی کی باتیں تنہائی میں ہی ہونی چاہئیں۔

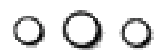
بہرحال اس سے کوئی اور خوش ہو نہ ہو' قوال' بھانڈ اور دوسرے فنکار جو ختنوں' ولیموں' عقیقوں' سالگروں اور دوسری تقریبات پر اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں' وہ بہت خوش ہوں گے کیونکہ اب ان موقعوں پر مشاعرے ہونے لگے تھے جس سے ان کا روزگار متاثر ہو رہا تھا۔ ایک شادی کی تقریب میں لاہور کے آج کے مشہور شاعر اپنی بذلہ سنجی سمیت موجود تھے۔ وہاں بھانڈوں کو اپنی دال گلتی نظر نہ آئی تو انہوں نے اہل خانہ سے کہا "اگر آپ نے انہیں بلوانا تھا تو پھر ہمیں کیوں بلوایا تھا؟" ہندوستانی

شاعرات تو مشاعرے میں وہ رنگ بھرتی ہیں کہ ایک نئے شخص نے انہیں خدا حافظ کہتے وقت "بائی" کہہ دیا جس پر وہ ناراض ہوئیں تو اس نے کہا "ابھی تو ایک شاعر جاتے ہوئے آپ کو یہی لفظ دو بار کہہ کے گئے تھے' میں نے خود سنا' وہ کہہ رہے تھے "بائی بائی......"

نثار اکبر آبادی کہتے ہیں شاعروں میں شعر پڑھنے کی نسبت کتابی شکل میں چھپوانے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اس طرح چوٹ لگنے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ ایسے شاعر ہیں کہ ایک مشاعرے میں سٹیج پر آئے تو لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ انہوں نے کہا "میں نے تو ابھی شعر سنایا ہی نہیں اور آپ داد دے رہے ہیں" تو حاضرین نے کہا۔ "اسی لیے تو داد دے رہے ہیں۔" ایک ایسے ہی شاعر کے دوست کی مشاعرے میں جوتی گم ہو گئی۔ شاعر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میرے سٹیج پر جا کر شعر سنانے کی دیر ہے' خود ہی مل جائے گی۔" ویسے مشاعروں میں شعر سنانا اتنا مشکل نہیں جتنا شعر نہ سنانا۔ پھر مشاعرہ دراصل شاعروں کے آپس میں مل بیٹھنے کا بہانہ ہوتا ہے۔ پنڈت ہری چند اختر اور عبدالحمید عدم مشاعرے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دیر تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ اس دوران عدم صاحب موٹے ہو گئے۔ ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تو اختر انہیں پہچان نہ سکے۔ انہوں نے پنڈت جی سے کہا "پہچانا نہیں' عدم ہوں۔" پنڈت جی نے انہیں دیکھا اور بولے "اگر تم واقعی عدم ہو تو وجود کیا ہو گا؟" جتنے زیادہ مشاعرے ہوں گے' شاعروں کی اتنی ہی پہچان ہو گی۔ اب تو میلہ مویشیوں پر بھی مشاعرے ہونے لگے ہیں جس سے ہمیں وہی خدشہ ہے جو ابن انشاء کو تھا کہ ایسی مخلوط تقریبات سے یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ اگلے دن غلطی سے اخبارات میں یہ خبر نہ چھپ جائے کہ بھینس کو یہ انعام بہترین غزل پڑھنے پر ملا اور ابن انشاء کو یہ انعام زیادہ دودھ دینے پر۔ شاعر تاریخ میں ہو تو ہم اسے اوتار سمجھتے ہیں اور اگر ساتھ والے کمرے میں ہوں تو مذاق اور وہ جس گھر میں ہوتا' وہاں اسے کوئی نہیں سمجھتا۔ بہرحال وہ جس گھر میں ہو' وہاں چوری نہیں ہوتی۔ جس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس گھر میں چرانے کے لیے کچھ

ہوتا ہی نہیں۔ مشاعرہ شاعروں کے لیے مشاہرہ ہوتا ہے۔ یوں مشاعروں پر پابندی دراصل ان کے روزگار پر لات مارنا ہے۔

شاعر شعروں میں جو کچھ کہتے ہیں' اگر وہ نثر میں کہہ دیں تو انہیں کوڑے پڑ جائیں۔ اس لیے گھروں میں مشاعرے نہیں ہوتے کہ وہاں بچے ہوتے ہیں۔ ان کے اخلاق پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ ایسے ہی جیسے بچوں کو اسمبلی میں لے جانے کی اس لیے اجازت نہیں کہ وہ لڑنا اور گالیاں دینا سیکھ جائیں گے۔ بنگال میں ایک بار اسمبلی میں مشاعرہ کرانے پر ڈپٹی سپیکر کی چھٹی ہو گئی تھی۔ مشاہرہ گاہیں وہ جگہیں ہوتی ہیں' جہاں شاعر اپنی خواہش پوری کر سکیں۔ یہ نہ ہو تو پھر یاس یگانہ چنگیزی کی طرح بندہ رات کے دو بجے بیوی بچوں کو اٹھا کر کہے گا "ابھی ابھی غزل ہوئی ہے' عرض کیا ہے؟" ساہیوال کے شاعر جعفر شیرازی صاحب کے گھر والوں نے تو اس سے تنگ آ کر انہیں کلام اور بلی سمیت گیراج میں منتقل کر دیا تھا جس پر لوگوں نے احتجاج کیا کہ یہ بڑی بے رحمی ہے۔ گھر والوں کو بلی کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لگتا ہے اجمل نیازی صاحب کی یہ سازش شاعروں کے خلاف نہیں دراصل ان کی بیویوں کے خلاف ہے۔ دیکھتے ہیں خواتین ان سے کیسے بدلہ لیتی ہیں کیونکہ وہ معاف نہیں کرتیں۔ ہمارے ایک کلاس فیلو نے ایک جونئیر کلاس کی لڑکی کو فرسٹ ائیر فول بنایا تو اس نے قسم کھائی کہ میں اسے ایسا فول بناؤں گی کہ ساری عمر یاد رکھے گا اور اس نے فائنل ائیر میں اس لڑکے سے شادی کر لی۔



• سانحہ عمری

سانحہ کی جمع سوانح اور سوانح عمری وہ کتاب ہوتی ہے جس کا سب سے اہم سانحہ اس کے آخری باب میں ہوتا ہے اور یہی باب اس کتاب میں نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں سوانح عمری میں اگر کوئی غلطی ملے تو یقین کر لیں' وہ کاتب کی غلطی ہو گی ورنہ تو ہنری کسنجر اپنی سوانح عمری کے بارے میں کہتے ہیں کہ میں نے اپنے بارے میں بڑا "فرینک" ہو کے لکھا ہے اور اس کتاب میں پہلی غلطی صفحہ 850 پر ہے لیکن مقامی اخبار نے مولانا عبدالقادر آزاد کی سوانح عمری کے پہلے صفحے پر ہی غلطی نکال دی۔ وہ یہ کہ موصوف نے اپنی تاریخ پیدائش 1938ء سے بدل کر 1947ء کرنے کے لیے گورنر سجاد حسین قریشی کو درخواست دی تھی۔ صاحب! ہم تو سمجھتے تھے کہ دنیا میں آپ سب بدل سکتے ہیں' سوائے تاریخ پیدائش کے مگر مولانا نے ہمیں حیران کر دیا۔ پیدا ہونا شروع سے ایک غیر جمہوری عمل رہا ہے کہ پیدا ہوتے وقت پسند کی جگہ' مقام اور تاریخ کے بارے میں بندے کا ووٹ نہیں لیا جاتا۔ اس دن کا ہر کسی نے اپنے حساب سے حساب رکھا ہوتا ہے۔ جیسے اداکار رنگیلے سے کسی نے پوچھا "آپ کب پیدا ہوئے؟" تو اس نے کہا "جب میری والدہ ہسپتال میں تھیں؟" اس کے ٹھیک دو دن بعد میں پیدا ہوا۔" پوچھا "والدہ ہسپتال کب داخل ہوئی تھیں؟" تو کہا "میرے پیدا ہونے سے ٹھیک دو دن پہلے۔" ایک ایسے ہی شخص نے بتایا کہ جب میری والدہ کراچی میں تھیں تو ایک بڑا مسئلہ پیدا ہوا۔ دوسرے نے کہا۔ "مگر تم نے مجھے پہلے تو نہیں بتایا کہ تم کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔"

ویسے پیدائش کی مبارک گھڑی پتہ کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کمیٹی سے برتھ سرٹیفکیٹ حاصل کریں لیکن کمیٹی والوں کی کارکردگی ایسی ہے کہ برتھ سرٹیفکیٹ لینے سے آسان طریقہ یہ ہے کہ بندہ دوبارہ پیدا ہو جائے۔ دفتری کام تو پھر ایسے ہی ہوتے

ہیں۔ ایک بزرگ پنشن لینے گئے تو انہیں کہا گیا "بڑے میاں میڈیکل سرٹیفکیٹ لاؤ کہ آپ زندہ ہیں۔" وہ رواں ماہ کا سرٹیفکیٹ لے آئے تو کہا گیا "گزشتہ ماہ کی پنشن لینے کے لیے ان مہینوں کا سرٹیفکیٹ لانا پڑے گا تاکہ پتہ چل سکے' ان مہینوں میں بھی آپ زندہ تھے۔"

ملازمت کے لیے برتھ سرٹیفکیٹ اہم ہوتا ہے۔ ایک شخص پرائیویٹ فرم میں انٹرویو دینے گیا تو انٹرویو کرنے والے نے پوچھا "آپ کے پاس کارکردگی کا کوئی سرٹیفکیٹ ہے؟" اس نے کہا "سر! میرے پاس صرف برتھ سرٹیفکیٹ ہے۔" تو اس نے کہا "میں آپ کی کارکردگی کی بات کر رہا ہوں۔" بہرحال مولانا آزاد نے جس برتھ سرٹیفکیٹ پر ملازمت لی' اس پر ان کی تاریخ پیدائش 1938ء تھی جسے پہلے انھوں نے 1939ء کرنا چاہا۔ پھر ارادہ بدل کر 1947ء کو پیدائش سال پسند فرمایا جس پر محکمہ اوقاف کو باقاعدہ 1988 میں ان کو خط لکھنا پڑا کہ ایک بار ہی اچھی طرح سوچ کر واضح تاریخ پیدائش کا تعین کر لیں۔ مولانا صاحب ویسے بھی رائے بدلتے رہتے ہیں۔ ایک بار بادشاہی مسجد کے مینار پر چڑھنے لگے تو فرمایا "یہ سیڑھیاں اوپر کو جاتی ہیں۔" تین منٹ بعد ہی مینار پر چڑھ کر ان کی رائے بدل گئی اور کہا "یہ سیڑھیاں نیچے کو جاتی ہیں۔" اگرچہ تاریخ کے ہیر پھیر کی ہمیں اتنی سمجھ نہیں۔ ہم تو جب پڑھتے کہ فلاں فاتح 476 قبل مسیح میں پیدا ہو کر 426 قبل مسیح میں فوت ہوا تو سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ بہرحال ہمیں مولانا کے اعداد و شمار سے ہی پتا چلا ہے کہ وہ اپنی عمر نو سال کم کرنا چاہتے تھے۔ ویسے تو عمر کے ساتھ لفظ نو لگ جائے تو اچھی خاصی عمر بھی نو عمر ہو جاتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ آج تک عمر کم کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں' وہ عورتوں نے کیں۔ یہ پہلی مردانہ کوشش تھی جو چیف سیکرٹری انور زاہد صاحب کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ ہو سکتا ہے مولانا نے یہ کوشش عورتوں کو نیچا دکھانے کے لیے کی ہو کیونکہ ان سے تو مولانا کی شروع سے لگتی ہے۔ حالانکہ عورتوں کو نیچا دکھانے کے لیے اپنی عمر کم کرنے کی بجائے ان کی عمر بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ عورت کے لیے سب

سے بڑی گالی یہ ہے کہ تم بوڑھی ہو رہی ہو۔ مرد اس وقت بوڑھا ہو جاتا ہے' جب وہ اپنی عمر چھپانے لگتا ہے اور عورت بوڑھی ہو جائے تو اپنی اصلی عمر بتانے لگتی ہے۔

پھر مولانا نے یہ سب 1988ء میں کیا۔ اگر ڈیانا کے دورے کے بعد کرتے تو اور بات تھی۔ ویسے بھی مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔

ایک خاتون نے دوسری خاتون سے کہا "مجھے انٹیکس سے بڑی دلچسپی ہو گئی ہے۔" تو دوسرے نے کہا "مجھے پتا ہے۔" پہلی بولی "تمہیں کیسے پتا ہے؟" تو وہ بولی "میں تمہارے خاوند سے مل چکی ہوں۔"

صاحب! سرکاری ملازمت میں لوگ عمروں کا ہیر پھیر کرتے ہی رہتے ہیں۔ ایک شخص کا بھائی بڑے عہدے پر تھا۔ اس نے درخواست دی کہ میری عمر نو سال کم کر دی جائے تو بھائی نے کہا "یہ ممکن نہیں۔" تو وہ صاحب ناراض ہو گئے کہ آپ بھائی ہو کر ملازمت میں توسیع کے لیے یہ نہیں کر سکتے۔ بھائی نے کہا "یہ تو کر سکتا ہوں مگر اس حساب سے تم والدہ کی وفات کے چار سال بعد پیدا ہوتے ہو۔" بہرحال ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ مولانا نے یہ سب ملازمت میں توسیع کے لیے نہیں کیا۔ چونکہ وہ آزاد ہیں' اس لیے وہ غلام ہندوستان میں پیدا ہونا نہیں چاہتے ہوں گے۔ سو انہوں نے تاریخ پیدائش 1938ء کی بجائے 1947ء رکھنا چاہی جو ان کی پاکستان سے محبت کی دلیل ہے۔ ہمارے تو ایک سیاستدان نے اعلان کیا تھا کہ مجھے پاکستان سے اس قدر محبت ہے کہ جب تک پاکستان بن نہ گیا' میں نے پیدا ہونا گوارا نہ کیا۔ اسی لیے پچھلے دنوں جب وہ امریکہ سیٹل ہوا تو اس نے خود پر "میڈ ان پاکستان" کا اسٹیکر لگایا ہوا تھا۔

○○○

• فلو انڈسٹری

اداکارہ شاہدہ منی کو بارش میں گیت فلماتے ہوئے فلو کیا ہو گیا' پوری فلم ٹیم یوں پریشان ہے جیسے یہ کسی کی اس فلم ٹیم کے خلاف سازش ہو۔ اگرچہ فلم کے لوگ رائی کو پہاڑ بنا دیتے ہیں جنہوں نے انجمن کو فلموں سے پہلے اور اب بھی دیکھا ہے' میری اس بات سے اتفاق کریں گے لیکن اس بار ان کا اندیشہ کچھ اتنا غلط بھی نہیں لگتا کیونکہ فلو یوں پھیلتا ہے جیسے ہماری ہیروئنیں پھیلتی ہیں۔ یوں یہ فلو' اس فلم ٹیم کو لگ سکتا ہے۔ فلم ٹیم کو لگ گیا تو سمجھ لیں پورے سٹوڈیو کو لگ گیا۔ یہی نہیں' اس کے اثرات ہم تک بھی آ سکتے ہیں۔

برسات کا موسم دراصل بر....... ساتھ کا موسم ہوتا ہے اور ہماری فلموں میں بارش کے گیت یوں فلمائے جاتے ہیں تاکہ فلمیں بھی با....... رش ہوں یعنی رش والی ہوں۔ پہلے ہیروئنیں بارش میں بھگونے کا رواج کم تھا جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہیروئنیں اتنی بڑی بلکہ بوڑھی ہوتی تھیں مصنوعی بارش میں انہیں مکمل بھگوانے پر بڑا خرچا آتا۔ بندہ ان دونوں "دو بھیگے بدن" کہتا تو لگتا "دو بیگھے بدن" کہہ رہا ہے۔ انجمن اور مسرت شاہین وغیرہ کے بعد اب بجٹ فلموں کا دور ہے۔ ہم نے ایک فلم ساز سے پوچھا "کیا دوسری ہیروئنیں کم پیسے لیتی ہیں؟" بولا "نہیں۔" پوچھا "پھر نئی اداکاراؤں سے لو بجٹ فلمیں کیسے بن سکتی ہیں؟" کہا "اس طرح کہ ان کو فلمانے میں کئی میٹر فیتہ لگتا ہے۔" نئی اداکاراؤں کے آنے سے یہ ہوا کہ اب پرانی اداکاراؤں کو لوگ بھولنے لگے ہیں۔ اگرچہ انہیں بھولنے کے لیے بڑی یادداشت چاہیے۔ ہمارا ایک دوست جو مسرت شاہین کی ہر فلم مسرت سے دیکھتا' پچھلے دنوں بازار میں مسرت شاہین کو دیکھ کر پہچان نہ سکا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا "دراصل ان کا فلموں میں چہرہ بہت کم دکھایا

جاتا ہے' اس لیے پہچان نہ سکا۔" بہرحال نئی اداکاراؤں کے آنے سے فلم انڈسٹری پھر سے دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگی ہے۔ محاورے میں رات چوگنی ترقی کیوں کہا جاتا ہے' اس کا تو ہمیں پتا نہیں بہرحال فلو نے یہ ترقی روک دی ہے۔ اگرچہ فلو اس قابل تو نہیں کہ اس کی تعریف کی جائے لیکن ڈکشنری میں اس کی تعریف "جنگی بخار" لکھی ہوئی ہے اور جتنی جنگ ہماری فلموں میں ہوتی ہے' اتنی تو میدان جنگ میں بھی نہ ہوتی ہو گی۔ سو اس لحاظ سے یہ فلمی بخار ہی ہے۔ ہمارے ہاں فلم بنانے کے لیے ایک ہیرو' ڈیڑھ من بارود اور اتنی ہی فلمی ہیروئن چاہیے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں فلم ڈائریکٹر کے بغیر تو بن سکتی ہے' یقین نہ آئے تو ہماری کوئی بھی فلم دیکھ لیں مگر قتل و خون کے بغیر نہیں بن سکتی۔ اس لیے ہمارے خونزو ہیرو سلطان راہی یہ نہیں پوچھتے کہ آج کتنے سین شوٹ کرنے ہیں۔ یہ پوچھتے ہیں "آج کتنے بندے شوٹ کرنے ہیں؟" ہیرو کو جو ملتا ہے' اسے قتل کر دیتا ہے۔ لگتا ہے فلم ختم ہونے تک وہ رائٹر اور ڈائریکٹر کو قتل کر دے گا۔ پوری فلم میں خون کی بارش جاری رہتی ہے۔ ہم تو خوش تھے' چلو فلم میں پانی کی بارش بھی شروع ہوئی مگر فلو رستے میں آ گیا۔ ایک بار یہ انجمن کو ہوا تو انہوں نے ہدایت کار سے کہا "سر کچھ بھاری بھاری ہو رہا ہے!" تو ہدایت کار نے کہا "میڈم یہ آپ نے سر! مجھے کہا؟" ایک نئی اداکار کا فلو سے گلا بھی خراب ہو گیا۔ اس کی نئی فلم کی مہورت پر اعلان ہوا کہ نئی ہیروئن اڈریس کرے گی تو اس کی والدہ نے اڈریس کا لفظ سنا تو کھڑی ہو کر بولی "بے بی کو فلو ہو گیا ہے' آپ کو ایڈریس ہی چاہیے تو میں بتا دیتی ہوں" اسی اداکارہ نے ڈاکٹر کو فون کیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا "گھر آ کے دیکھنے کے پانچ سو روپے ہوں گے۔" تو اداکارہ نے کہا "ٹھیک ہے! پانچ سو ہی دے دینا۔" ملکہ ترنم نور جہاں نے فلو کی حالت میں جتنے گیت گائے ہیں' ان میں اس قدر سوز ہے کہ سننے والے کی بھی وہ حالت ہو جاتی ہے جس میں ملکہ نے یہ گائے ہیں۔ سو ٹریجڈی فلموں کے لیے تو فلو ضروری ہے مگر یہاں

پھر مسئلہ ہے۔ کسی نے ہدایت کار حیدر چودھری صاحب سے پوچھا "آپ کی یہ فلم ٹریجڈی ہے یا کامیڈی؟" تو انہوں نے کہا "میرے بادشاہ فلم لگے گی تو پتہ چلے گا۔" پوچھا "وہ کیسے؟" بولے "میرے بادشاہ اگر فلم چل گئی تو کامیڈی، نہ چلی تو ٹریجڈی۔" لیکن یہ فلو ہدایت کار کو بھی تو ہو سکتا ہے۔ ایک بار ہدایت کار یونس ملک نے کہا "مجھے لگتا ہے کہ مجھے فلو ہو گیا ہے یا پھر سر میں کچھ ہے۔" تو پاس کھڑے اسسٹنٹ نے کہا "استاد سر میں کچھ نہیں ہے، یہ فلو ہی ہے۔"

فلم اور فلو میں ایک فرق تو یہ ہے کہ فلم سکرین پر ہوتی ہے اور فلو سینے میں۔ یوں بھی فلو مذکر ہے۔ اس لیے ہیروئنوں کو لگنے کا خطرہ اور بھی زیادہ ہے۔ پھر ہ وہ مرض ہے کہ آپ دوائی لیں گے تو ایک ہفتے میں ٹھیک ہو گا۔ اگر دوائی نہ لیں گے تو ٹھیک ہوتے ہوتے پورے سات دن لگیں گے۔ ہمارے بزرگ تو اس سے بچنے کے لیے اس قدر احتیاط کرتے ہیں کہ "بارش" والی فلمیں منہ پر صافہ یا کوئی کپڑا لپیٹ کر دیکھنے جاتے ہیں۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ فلم میں بارش نہیں ہونی چاہیے لیکن چونکہ بارش سے پانی میں کپڑے گیلے ہو کر فلو کر دیتے ہیں۔ سو یا تو ایسا پانی استعمال کرنا چاہیے جو گیلا نہ ہو یا پھر بارش بغیر پانی کے برسائی جائے ورنہ فلم انڈسٹری "فلو انڈسٹری" بن جائے گی۔



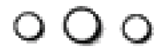
• مبارک ہو

یہاں مبارک سے مراد نثری شاعر مبارک احمد نہیں ہیں کیونکہ وہ ایسے ہیں کہ بندہ ان کے سامنے کسی اور سے کہہ دے "مبارک ہو!" تو فوراً کہیں گے "نہیں! مبارک یہ نہیں' میں ہوں۔" وہ تو عید کارڈ پر مبارک لکھا دیکھ کر سمجھتے ہیں' وہ مشہور ہو رہے ہیں۔ ہم نے یہ مبارک اس لیے دی ہے کہ ایبٹ آباد بورڈ کے ایک طالب علم نے سو میں سے 120 نمبر لے کر نہ صرف بورڈ بلکہ پورے براعظم میں اول پوزیشن حاصل کی ہے۔ یہ تو برا ہوا کہ لڑکے نے جس پرچے میں اتنے اچھے نمبر حاصل کیے' وہ دیا ہی نہیں تھا ورنہ اگر دیا ہوتا تو ممکن ہے' وہ سو میں سے دوسو نمبر حاصل کر لیتا۔ اس سے قبل سندھ کے ایک وڈیرے کے بھائی نے انٹرویو میں سو میں سے 105 نمبر حاصل کیے تھے جس کی وجہ انٹر ویو لینے والوں نے یہ بتائی تھی کہ موصوف نے ہر سوال کا صحیح جواب دیا اور سو میں سے سو نمبر حاصل کیے لیکن کچھ اس نے ایسے جواب بھی دیئے جن کا انٹرویو کرنے والوں کے پاس کوئی سوال نہ تھا۔ یوں اضافی پانچ نمبر حاصل کر کے 105 نمبر حاصل کیے۔

لوگوں نے اتنے اچھے نمبر حاصل کرنے پر محکمہ تعلیم کا شکریہ اور لڑکے کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے الٹا اعتراض کیا ہے۔ بہرحال اخبار نے اسے بڑے کمال کا لڑکا بتایا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ اس پر بھی اعتراض کریں' جیسے ایک اخبار نے لکھ دیا' فلاں فلم کا ہیرو کمال کا لڑکا ہے!" تو اداکار سید کمال صاحب نے کہا "یہ غلط ہے وہ میرا لڑکا نہیں ہے۔" ویسے ہمارے خیال میں تو اتنے نمبر لینے والا جن کا لڑکا ہے' وہ کمال کے ہیں۔ ہو سکتا ہے لوگ اس پر بھی اعتراض کریں کہ ہم نے اسے "جن" کا لڑکا لکھا ہے۔ بہرحال اس کی وجہ سے ہمارے محکمہ سے ہمارے محکمہ تعلیم کا نام گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں آ سکتا ہے۔ پھر یہ ایسا ریکارڈ ہے جسے دنیا کا کوئی بھی طالب

علم اس وقت تک نہ توڑ سکتا' جب تک وہ پاکستان میں آ کر امتحان نہ دے۔
کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس لڑکے نے یہ نمبر نقل کی وجہ سے حاصل کیے ہیں۔ ویسے تو ایبٹ آباد بورڈ کے کنٹرولر نقل کے بہت خلاف ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہو گی کہ نقل کے لیے عقل چاہیے۔ یوں ہو سکتا ہے انہوں نے یہ نمبر اس طالب علم کو نقل کی وجہ سے دیئے ہوں کہ وہ واحد لڑکا تھا جس نے اس پرچے میں نقل نہیں کی کیونکہ اس نے یہ پرچہ دیا ہی نہیں تھا۔ ویسے پرچہ اور طالب علم لازم و ملزوم ہیں۔
کسی نے ایک طالب علم سے پوچھا "تم پر کتنے پرچے ہوئے ہیں؟" اس نے کہا "کوئی نہیں۔" تو پہلے نے کہا "مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم روز کالج نہیں جاتے۔" طلبہ کی تعلیم میں دلچسپی تو اتنی ہے کہ ایک سکول میں محکمہ شہری دفاع والے ٹریننگ دے رہے تھے کہ اگر خدا نخواستہ بلڈنگ کو آگ لگ جائے تو فوراً اسے کیسے خالی کرنا ہے؟ ایک ماہ کی ٹریننگ کے بعد وہ صرف چار منٹ کے نوٹس پر ساری بلڈنگ خالی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی خوشی میں سکول انتظامیہ نے پہلی کلاس کے بعد ساری چھٹی کی گھنٹی بجا دی اور پوری عمارت دو منٹ میں طلبہ سے خالی ہو گئی۔
اتنے نمبر حاصل کرنے کا راز تو محکمہ تعلیم ہی بتا سکتا ہے کیونکہ وہ ہم سے زیادہ جانتا ہے۔ جیسے ایک آنکھ والے نے دو آنکھوں والے سے شرط لگائی کہ مجھے زیادہ نظر آتا ہے۔ دو آنکھوں والے نے پوچھا۔ "کیسے؟" تو بولا "تمہیں اس وقت میری ایک آنکھ نظر آ رہی ہے جبکہ مجھے تمہاری دو آنکھیں نظر آ رہی ہیں' سو مجھے زیادہ نظر آتا ہے۔"
محکمہ تعلیم کے لوگوں کی ڈیوٹیاں اکثر الیکشنوں پر لگتی ہیں۔ ہو سکتا ہے یہ راز انہوں نے وہاں سے پایا ہو کہ دس ہزار ٹوٹل ووٹوں میں سے گیارہ ہزار حاصل کر کے کس طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ پھر وزیر تعلیم بڑے کھلے دل کے ہیں۔ کوئی دس روپے مانگے تو پچاس دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی وجہ سے سارا محکمہ کھلے دل کا ہو گیا ہو جو پچاس نمبر مانگتا ہو' اسے ایک سو بیس دے دیتے ہوں۔ ان سے پوچھا الف کے بعد

کونسا حروف تہجی آتا ہے تو کہیں گے ''الف کے بعد سارے ہی حروف تہجی آتے ہیں۔''
ہندوؤں کی ایک مقدس کتاب میں عورتوں کے 404 چلتر لکھے ہیں جس کی وجہ یوسفی صاحب نے یہ بتائی ہے کہ اس وقت تک صرف یہیں تک گنتی آتی تھی۔ ہو سکتا ہے محکمہ تعلیم ابھی تک 120 پر ہی ہوں۔ جوں جوں ان کی گنتی بڑھے گی، نمبروں میں اضافہ ہو گا۔ ہم نے محکمہ تعلیم کے ایک افسر سے پوچھا ''آخر سو میں سے 120 نمبر کس پرچہ پر ملے؟'' تو انہوں نے کہا ''آپ کا سوال ہی غلط ہے، آپ پوچھیں سو میں سے 120 کس پرچی پر ملے؟''



• پاکستان ڈانس پارٹی

صاحب! جب سے فلموں میں ڈانسنگ ہیروز کا دور آیا ہے' تب سے غیر فلمی ہیرو بھی ڈانس کے غیر ادھورے لگنے لگے ہیں لیکن پچھلے دنوں انڈونیشیا کے سفارتخانے میں قومی اسمبلی کے اسپیکر گوہر ایوب صاحب نے ایسا ڈانس کیا کہ ساری کمی پوری کر دی۔ خواتین کے ساتھ تو ان کی تصویریں ویسے ہی بہت اچھی آتی ہیں۔ انڈونیشی دوشیزہ کے ساتھ رقص کی تصویر اخبار میں ایسی آئی ہے کہ اس دن سے ڈاکٹر فقیر حسین ساگا صاحب خوش پھر رہے ہیں کہ میرے علاوہ پہلی بار کسی کی "بحالت رقص" ایسی تصویر آئی ہے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کے خوش ہونے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ پتہ نہیں چلتا خوش ہو رہے ہیں یا خوش ہو رہی ہیں۔ بہرحال خوشگوار حیرت ہمیں بھی ہوئی کہ گوہر ایوب صاحب کا تعلق تو اس گھرانے سے ہے جہاں بچے پیدا ہی فوجی وردی میں ہوتے ہیں۔ ان کے والد صدر ایوب صاحب کو فوج سے اتنی ہی محبت تھی تو انہوں نے بیٹوں کو فوج سے فارغ کیوں کروایا؟ حالانکہ اسی لیے تو انہوں نے بیٹوں کو فوج سے فارغ کروایا تھا۔

سینٹ ایکسیوایری نے کہا ہے "اس طرح محبت کرو جیسے فوجی کرتا ہے اور اس طرح لڑو جیسے عاشق لڑتا ہے۔" کیپٹن گوہر ایوب نے عمر بھر ایسے ہی کیا۔ یہاں تک کہ لوگ انہیں MrGo-Her Ayub تو کہتے "22-" سو فوج پر کاروبار کو ترجیح دی۔ ویسے بھی کاروبار کے کیا کہنے کہ اس میں کار بھی ہے اور بار بھی۔ فوجی خاندان سے ہونے کی وجہ سے انہیں جنرل اس قدر پسند تھے کہ کاروبار کے لیے بھی جنرل موٹرز کو چنا۔ کاروباری آدمی وہ ہوتا ہے جو گڑھے میں بھی گر جائے اور کوئی اسے نکالنے کے لیے بڑھے تو اسے یہ نہ کہے "یہ لو ہاتھ!" کہے "دو ہاتھ!" کیپٹن گوہر ایوب کا کاروبار ایسا چلا کہ گندھارا موٹرز سے بات گندھارا انڈسٹری تک آ گئی۔ صدر ایوب صاحب نے

جب اپنی سوانح عمری لکھی تو اس کا نام "Endure And Prosper) رکھا یعنی پہلے برداشت کرو، پھر پھلو پھولو۔ لوگوں سے صدر صاحب کے بچوں کا پھلنا پھولنا برداشت نہ ہوا اور پنجاب یونیورسٹی کے ایک استاد نے کہہ دیا کہ اس کتاب کا نام ہونا چاہیے۔ "Prosper You Endure And We" ایوب خان کو پتہ چلا تو پھر انہوں نے فوراً نام بدل کر "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" کر دیا جس پر ذوالفقار علی بھٹو صاحب نے کہا "ماسٹرز ناٹ فرینڈز" صدر ایوب صاحب کے لیے ان کے بیٹے ہی پوری دنیا تھے کیونکہ ان کو سنبھالنا ایسے ہی تھا جیسے پوری دنیا کو سنبھالنا۔

ایک امریکی سے کسی نے فوج چھوڑنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا "فوج وہ شعبہ ہے جہاں سر کا اتنا استعمال نہیں ہوتا جتنا پاؤں کا ہوتا ہے۔" یہی رقص کا اصول ہے۔ کسی نے رقص کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا "رقص ایک افقی خواہش کا عمودی اظہار ہے۔" رقص کو اعضاء کی شاعری بھی کہتے ہیں۔ اسی لیے تصویر میں جناب گوہر ایوب صاحب قدم یوں اٹھا رہے ہیں جیسے مصرع اٹھا رہے ہوں۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں، اپنے ملک کے لیے کرتے ہیں اور ہمارے ہاں صوفیوں کی روایت ہے کہ "نچ" کے یار کو منانے سے عزت نہیں گھٹتی، یہی طریقہ فلموں میں بھی رائج ہے۔ سو ہو سکتا ہے، وہ رقص کر کے دونوں ملکوں کو اور قریب لانا چاہتے ہوں۔ اگرچہ تصویر میں دونوں ملکوں میں چند انچوں کا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔

مدراس کی کلاسیکل رقاصہ ساہی کورے نے کہا ہے "رقص 101 بیماریوں کا علاج ہے۔" یہ تعداد اس وقت کی ہے، جب انسان کو صرف 101 بیماریاں ہوتی تھیں۔ کورے کہتی ہیں "اس سے موٹاپا، پیٹ، پٹھوں کا درد بلکہ وہ درد جو ابھی ہونے ہوتے ہیں، وہ بھی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔" صاحب! علاج کے لیے تو حرام چیز بھی جائز ہوتی ہے۔ سو مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کے بقول اگر اسپیکر صاحب نے حرام کام کیا ہے تو ہو سکتا ہے، انہوں نے بطور دوائی یہ نسخہ استعمال کیا ہو۔ ہم تو رقص کو ورزش ہی سمجھتے رہے، آپ نہیں سمجھتے تو اداکارہ انجمن کو رقص کرتا دیکھ لیں۔ سو ہو سکتا ہے گوہر ایوب صاحب

خود کو فٹ رکھنے کے لیے ورزش کر رہے ہوں۔ اگر کوئی اس کی وجہ پوچھے تو وہ بھی اس تصویر میں وضح نظر آ رہی ہے۔ ایسے ہی برنارڈ شا اور جے کے چسٹرٹن کی کسی نے اکٹھی تصویر بنائی۔ برنارڈ شا لمبا اور پتلا جبکہ جے کے چسٹرٹن موٹا اور چھوٹا تھا۔ جے کے چسٹرٹن نے تصویر دیکھ کر کہا "اگر کوئی برنارڈ شا کی یہ تصویر دیکھ لے تو وہ سمجھے انگلینڈ میں قحط پڑا ہوا ہے۔" برنارڈ شا نے کہا "اور آپ کو ساتھ تصویر میں دیکھ کر اسے قحط کی وجہ کا پتہ بھی چل جائے گا۔" بہرحال اس رقص پر رقاص حلقوں میں بڑا رقص ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے فقیر حسین ساگا یا سابق امیدوار صوبائی اسمبلی اسلم خسرہ صاحب اس پذیرائی سے متاثر ہو کر پاکستان ڈانس پارٹی یعنی پی ڈی پی منظم کرنا شروع کر دیں۔ ویسے بھی ہماری سیاست میں آج کل "تیسری قوت" کا بڑا چرچا ہے۔ یوں اس پارٹی کا بڑا سکوپ ہو گا۔ یہی نہیں جس طرح نواز شریف صاحب دوسرے ملک سے دوستی کے لیے کرکٹ میچ کھیلتے ہیں۔ ایسے ہی اگر یہ پارٹی ملک ملک جا کر کمپین چلاتی تو شاید آج گوہر ایوب صاحب بین الاقوامی پارلیمانی کمیٹی کے اسپیکر منتخب بھی ہو چکے ہوتے۔ ویسے بھی اسپیکر صاحب کو ناچ کا عملی تجربہ ہونا چاہیے تاکہ انہیں پتہ چل سکے کہ کون کون سے سیاستدان کس کس کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ ہو سکتا ہے' آپ اس ڈانس کلچر پر ایگری نہ کریں' ویسے بھی جس کلچر پر سب ایگری کرتے ہیں' وہ ایگری کلچر ہی کہلا سکتا ہے۔

○○○

• گنجے فرشتے

ہمیں یہ تو نہیں پتہ منٹو صاحب نے گنجے فرشتے کہاں دیکھے لیکن ہم نے لیڈی ولنگٹن ہسپتال کے لیبر روم میں اپنی ڈیوٹی کے دوران ہر فرشتہ گنجا ہی پیدا ہوتے دیکھا' سب نے بعد میں ہی بال نکالے۔ لانگ فیلوز نے تو یہاں تک کہا ہے "جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے بال نہیں ہوتے' بوڑھے بھی بے بال ہوتے ہیں۔" گویا گود سے گور تک کا فاصلہ ایک ہیئر کٹ اور ایک شیو کا ہے۔ ہو سکتا ہے منٹو صاحب نے فرشتوں کو گنجے نہ کہا ہو بلکہ گنجوں کو فرشتہ کہا ہو لیکن وہ آج کے دور میں گنجوں کو فرشتہ کہتے تو لوگ سمجھتے انہوں نے نواز شریف مسلم لیگ جوائن کر لی ہے۔

گنج خزانے کو کہتے ہیں اور فیصل آباد کے دو "مبینہ" ڈاکٹروں نے بذریعہ اشتہار یہ ترغیب دی ہے کہ گنجے اپنا سارا وقت گنج بال اگانے میں لگا دیں۔ ان ڈاکٹروں نے سند کے طور پر اپنی تصویریں اشتہار میں دی ہیں جو اتنی اخبار میں چھپی ہوئی نہیں ہیں' جتنی بالوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک ایسا شخص حجام کے پاس گیا تو حجام نے پوچھا "آپ نے پہلے کہاں سے کٹنگ کرائی؟" تو وہ شخص بولا "آپ سے!" حجام نے کہا "مگر مجھے تو یہاں آئے صرف دو سال ہوئے ہیں۔" کٹنگ پر جب اس حجام نے بہت دیر لگا دی تو وہ شخص بولا "آپ اتنی دیر سے کیا کر رہے ہیں؟" حجام نے کہا "بال کاٹنے لگا تھا کہ قینچی آپ کے بالوں میں گر گئی' اس وقت سے ڈھونڈ رہا ہوں کیونکہ یہاں بال وبال ہیں۔"
مغرب میں ایک دور میں ایسے ہپیوں میں سے کوئی کہتا کہ مجھے بالکل نظر نہیں آ رہا تو ساتھی اسے اٹھا کر آنکھوں کے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی بجائے نائی کے پاس لے جاتے۔ ان "مبینہ" ڈاکٹروں کو اشتہار میں شہرہ آفاق سائنس دان لکھا گیا ہے۔ اگر عظیم سائنس دان لکھا ہوتا تو ہم سمجھتے عظیم ان کا نام ہے۔ بہرحال یہ پڑھ کر خوشی

ہوئی کیونکہ اس سے پہلے ہمارے پاس صرف افتخار ایشیا ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری ہی تھے۔ اب یہ شہرہ آفاق فیصل آبادی بھی آ گئے۔ مارک ٹوئن سے کسی نے پوچھا "سب سے بڑا موجد کون سا ہے؟" تو انہوں نے کہا "اتفاق' کیونکہ بیشتر ایجادات اتفاق سے ہوئیں۔" سو ان دو "مبینہ" ڈاکٹروں نے بھی آپس میں اتفاق کر کے بال اگانے والی دوائی ایجاد کر دی مگر اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ایک ایسے ہی سائنسدان نے ایک مشین ایجاد کی تو کسی نے پوچھا "یہ کس کام آئے گی؟" تو سائنسدان نے کہا "ابھی مجھے اس کا استعمال تو دریافت کرنا ہے۔" سو ہو سکتا ہے کہ ان سائنس دانوں نے دوائی کا استعمال پہلے دریافت کر لیا ہو اور دوائی ابھی تک "ایجاد" نہ کی ہو لیکن انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں گنجوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جس سے تو لگتا ہے' لوگ ان کی دوائی استعمال بھی کر رہے ہیں کیونکہ گنجے اتنے خود سر ہوتے ہیں کہ جہاں ایسی خبر سنتے ہیں' خود اپنا سر آگے کر دیتے ہیں۔ اسی لیے تو دعا ہے کہ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ ویسے بھی فیصل آباد اتنا زرخیز علاقہ ہے کہ پہلے ہی منصوبہ بندی والے بہت پریشان ہیں کہ یہاں "بال" بہت ہوتے ہیں۔ اب ان سائنسدانوں بلکہ "دانوں" نے بھی بالوں کی دوائی کی نوید سنا دی۔

گنجے کا لفظ سن کر ہمارے ذہن میں ہمیشہ مرد کا ہی سر آیا' شاید اسی لیے عورتوں کو "سر" نہیں کہتے لیکن ان اشتہاری ڈاکٹروں نے اشتہار میں نادیہ نامی کسی خاتون کی تصویر گنجوں میں شامل کر کے خواتین کو بھی برابر کی نمائندگی دے دی جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ماشاء اللہ اب خواتین بھی کسی شعبے میں مردوں سے پیچھے نہیں۔ اردو ادب میں تو پہلے ہی اس محاورے کی صورت میں ان کی نمائندگی ہے کہ "گنجی دھوئے گی کیا اور نچوڑے گی کیا؟" ویسے بھی ہر گنجے کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے جو اس کے "بالوں" کی ماں کہلاتی ہے۔ ایک صاحب نے دوسرے سے کہا "تمہارے بال بڑی تیزی سے کم ہو رہے ہیں' اس کا کچھ کرتے کیوں نہیں؟" تو اس نے کہا "ہاں' میں طلاق

لینے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

کسی نے نشہ کرنے والے بھکاری سے پوچھا "مانگتے کیوں ہو؟" اس نے کہا "تا کہ نشہ کر سکوں۔" پوچھا "نشہ کیوں کرتے ہو؟" کہا "اس لیے کہ مانگتے ہوئے شرم نہ آئے۔"

بالوں کے بغیر تو کرکٹ بھی نہیں کھیلی جا سکتی۔ ایک باؤلر بال کروا رہا تھا' امپائر ہر بال پر کہتا "نوبال" آخر تنگ آ کر گنجے باؤلر نے کہا "آخری بار سمجھا رہا ہوں' اگر تم نے پھر ذاتی اٹیک کیا تو میں تم پر اٹیک کر دوں گا۔" عورتوں کو بال اس قدر عزیز ہوتے ہیں کہ وہ تو اپنے بچوں کو بھی کہتی ہے' یہ میرے "بال" ہیں لیکن گنج کی قدر کرنے والے بھی کم نہیں۔ ایران میں تو لوگ شادی کے لیے "گنجی" عورتیں ڈھونڈتے ہیں تا کہ مالی حالات سدھر سکیں۔ پھر عاشق کا محبوب کو چاند کہنا دراصل اس کے گنج ہی کی تعریف کرنا ہے لیکن ایک بار مشاعرے میں اکٹھے چار گنجے آ گئے تو جوش ملیح آبادی نے جوش میں آ کر کہا "آپ نے تو ہمارے مشاعرے کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔" ویسے بھی چہرے اور چاند میں یہی قدر مشترک ہو سکتی ہے کہ چہرے پر چاند کی طرح داغ دھبے ہوں ورنہ تو گنج میں ساری چاندی والی خوبیاں ہیں یعنی ویران' بے آباد اور چٹیل خطہ' پھر گنجوں کو یہ بڑا فائدہ ہوا ہے کہ بال کٹوانے پر وقت اور رقم خرچ نہیں ہوتی۔ ہر وقت جیب میں پین کی طرح کنگھی لگائے گھومنا نہیں پڑتا۔ جب اور جہاں دل چاہا ٹا کی سر پر پھیری اور چمکتے سر کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ پھر ایک کے بال دوسرے کے بالوں سے کم ہی ملتے ہوں گے مگر تمام گنجے ہم سر ہوتے ہیں۔ ایسے اشتہارات ان کی بقا کے خلاف ہیں۔ سو سب گنجوں کو سر جوڑ کر اس پر سوچنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو جیسے ایک گنجا کسی ایسے ہی "سائنسدان" کے پاس گیا۔ "سائنسدان" نے اس کا سر دیکھ کر کہا "آپ نے پہلے بھی میری دوائی استعمال کی ہے؟" تو گنجے نے کہا "نہیں' یہ جو سر پر زخم کا نشان ہے' دراصل یہ چوٹ کا ہے۔"

• محترمہ یونیورسٹی صاحبہ

لیجیے صاحب! اوساکا یونیورسٹی جاپان کے استاد اور پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم سویا مانے صاحب نے فرمایا کہ پنجاب یونیورسٹی اور اوساکا یونیورسٹی میں وہی فرق ہے جو مرد اور عورت میں ہے۔ ہم نے دونوں یونیورسٹیوں کی تصویریں بڑے غور سے دیکھیں مگر ہمیں وہ فرق نظر نہ آیا جس پر سویامانے نے ان کی جنس کا تعین کیا ہے۔ یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ یہ بات انہوں نے اوساکا یونیورسٹی کی تعریف میں کہی ہے یا پنجاب یونیورسٹی کو عورت کہہ کر اس کے "حسن سلوک" بلکہ حسن اور سلوک کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ وہ پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے طالب علم ہیں اور ہماری اردو شاعری میں جس کی بھی تعریف کرنا ہو' اسے محبوبہ کہتے ہیں۔ سو ہو سکتا ہے اردو شاعری کے زیر اثر انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کو نازک اندام اور حسین کہنے کے لیے خاتون کا لفظ استعمال کیا ہو لیکن یہ بات بھی یقین سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ جاپانی تو اپنی محبوبہ کی بھی تعریف کر رہے ہوں تو لگتا ہے کسی مشین کے پرزوں کی افادیت بتا رہے ہیں۔ سو اگر تعریف ہی کرنا مقصود ہوتی تو اسے مشین کہتے۔

جاپان سے ہمارا پہلا تعارف اس وقت ہوا جب ہمارا استاد ہمیں روزانہ آٹھ آنے دے کر کہتا "جاپان لا" ہم سمجھتے وہ جاء جہاں سے زیادہ پان ہوتے ہیں' وہ جاپان ہے لیکن کئی سال تک مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے وہاں کا چکر نہ لگایا تو ہمیں پانوں والی بات جھوٹ لگنے لگی۔ پھر ایک جاپانی نے بتایا کہ یہ تو مجمع الجزائر ہے جہاں پانی سے گھرے جزیرے ہیں۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ وہ جزیرے جاپانی کیوں ہیں۔

جنگ عظیم دوم میں ہیرو شیما پر گرائے گئے بموں نے شیما کو تباہ کر دیا اور ہیرو بچ گیا۔ دوسرے دن رات ایک کرنے کے لیے دن کو رات کرتے رہے اور یہ رات کو دن بنانے میں لگا رہا۔ یہی جاپان جب دنیا بلٹ بنانے میں لگی تھی' یہ بلٹ ٹرین بنا رہا تھا۔

اب تو جاپان کی چیزیں اس قدر دیرپا ہوتی ہیں کہ وہاں کے تو بادشاہ بھی پچاس پچاس سال چلتے ہیں۔ ہر وہ شخص کار رکھ سکتا ہے جس کے پاس کار پارکنگ کی جگہ ہو۔

جاپان میں زلزلے اس قدر آتے ہیں کہ ست لوگ تو وہاں چائے میں چینی ڈال کر چمچ سے ہلانے کی بجائے زلزلہ آنے کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ وہاں کے پہلوان اس قدر موٹے ہوتے ہیں کہ وہ آ رہے ہوں تو لگتا ہے فیوجی پہاڑ چل رہا ہے۔ ایک ایسا پہلوان زلزلے کی وجہ سے گھر سے نکل کر گلی میں آیا تو ہمسائے نے پوچھا "آپ زلزلے کی وجہ سے باہر آ رہے ہیں یا زلزلہ آپ کے باہر آنے کی وجہ سے آیا ہے؟" وہ بدھ مت کو پسند کرتے ہیں۔ ہمیں بھی بدھ پسند ہے بشرطیکہ اس دن چھٹی ہو۔ تازہ ترین اور حیرت انگیز سروے رپورٹ کے مطابق جنگ عظیم دوم کے بعد سے جاپانیوں کا اوسط قد بڑھ رہا ہے اور پاکستانیوں کا اوسط قد کم ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے پچاس سال بعد ہم بھی جاپانی لگنے لگیں۔ وہ اس قدر پڑھتے ہیں کہ ہر وقت دو کتابیں ان کی بغل میں ہوں گی۔ پوچھا "دو کیوں؟" کہا "ایک اس لیے کہ جب پڑھنے کو دل چاہا' کھول کر پڑھنے لگے اور دوسری کتاب اس لیے کہ کبھی پڑھنے کو دل نہیں بھی چاہتا۔" بک تو ہم بھی ساتھ رکھتے ہیں بشرطیکہ اس سے مراد چیک بک ہو۔ سیاما نے بتایا کہ ان کے ہاں تو محبوبہ کو بھی محبوبہ نہیں کہتے۔ پوچھا "کیا اس کے لیے کوئی لفظ نہیں؟" کہا "اس کے لیے کوئی وقت نہیں۔" اس سے تو لگتا ہے انھوں نے یونیورسٹی کو خاتون اس لیے کہا ہے کہ یہ بھی وقت ضائع کرتی ہے۔ کسی نے کہا تھا کہ جو کچھ بندہ بیس سالوں میں سیکھتا ہے' عورت اسے بیس دنوں میں بھلا سکتی ہے۔ یہ بات بھی شاید مسز لارڈ میکالے یعنی محترمہ یونیورسٹی صاحبہ کے لیے کہی گئی ہو کیونکہ یہاں سے جو بھی طالب علم فارغ العلم ہو کر نکلتا ہے' وہ بقراط سے کم نہیں ہوتا اور بقراط وہ دانشور ہے جسے اس کے دور کے لوگوں نے کہا کہ آپ کا علم اس دور کے سب عالموں سے زیادہ ہے تو بقراط نے کئی عالموں اور دانشوروں سے ملاقاتوں کے بعد کہا "واقعی میرا علم

ان سب سے زیادہ ہے کیونکہ مجھے یہ تو علم ہے کہ مجھے کچھ علم نہیں جبکہ انہیں تو اس کا بھی علم نہیں۔" سو یونیورسٹی سے نکلنے کے بعد بندے کو یہی علم ہوتا ہے۔ ایک ایسے طالب علم سے استاد نے کہا "تمہیں یہ بھی نہیں پتہ کہ علامہ اقبال کب پیدا ہوئے' حالانکہ سامنے بورڈ پر 1877ء سیالکوٹ لکھا ہے۔" تو اس نے کہا "سر! میں تو سمجھ رہا تھا' یہ ان کا فون نمبر ہے۔" ایک طالب علم جو یونیورسٹی میں داخلے کے لیے دن رات پڑھ رہا تھا' وہ یونیورسٹی کے ایک استاد کے گھر گیا کہ میری رہنمائی کریں' میں یونیورسٹی جانا چاہتا ہوں تو استاد نے کہا "یہاں سے 33 نمبر ویگن میں بیٹھ جاؤ' سیدھی وہیں جاتی ہے۔" ویسے بیروزگاری پھیلانے میں یونیورسٹی بڑا اہم رول ادا کر رہی ہے۔ اسے بند کر دیں تو سالانہ ہزاروں بیروزگاروں کی تعداد میں کمی آ جائے گی۔ ویسے بھی اب اس محترمہ کو گھر کا خرچہ ملنا بھی بند ہو ہی رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اسے عنقریب نان نفقے کا دعویٰ دائر کرنا پڑے۔ ہسبنڈ اس کے ساتھ وہی سلوک کر رہے ہیں جو ہمارے ہاں خواتین کے ساتھ ہوتا ہے۔ بہرحال سویامانے کے اس بیان کے بعد الگ زنانہ یونیورسٹی کے مطالبہ میں وزن نہیں رہا۔ ہاں البتہ مردانہ یونیورسٹی کی کمی محسوس ہونے لگی ہے۔ جاپانی وہاں بھی عقل استعمال کرتے ہیں جہاں ہم ہاتھ استعمال کرتے ہیں۔ سو ہو سکتا ہے اس سال گرتے میرٹ کو دیکھ کر سویامانے نے نوجوانوں کی یونیورسٹی میں عدم دلچسپی محسوس کی ہو اور انہوں نے لوگوں کو یونیورسٹی کی طرف متوجہ کرنے کے لیے اسے خاتون قرار دے دیا ہو۔ ویسے اگر یہی حال رہا تو ہو سکتا ہے محترمہ خود اپنے بارے میں اشتہار دیں۔

چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یاد رہے یہاں گلشن سے مراد کوئی خاتون نہیں ہے۔

○○○

• گھڑ دوڑ

پچھلے دنوں ہارورڈ یونیورسٹی میں مختلف ممالک کے طالبہ کو گھوڑے پر آرٹیکل لکھنے کو کہا گیا تو ہر طالب علم نے اس کا الگ موضوع رکھا۔ فرانسیسی طالب علم کا موضوع "گھوڑوں کی جنسی زندگی" انگریز کا "گھوڑوں کا شکار" کینیڈین طالب علم کا "صحت مند گھوڑوں کی افزائش نسل کے جدید طریقے" اور امریکی کا "گھوڑوں میں گدھا پن" تھا۔ بھارتی طالب علم نے اپنے مضمون کا عنوان "گھوڑوں کو "رام" کرنے کے طریقے" رکھا جبکہ پاکستانی طالب علم کا موضوع تھا "گھوڑے اور تحریک عدم اعتماد۔"

صاحب! ہم اس طالب علم کو تو نہیں جانتے البتہ گھوڑے کو جانتے ہیں۔ اگر وہ صرف "تحریک عدم اعتماد" لکھتے تو ہم سمجھتے' یہ کوئی ادبی تحریک ہے جو عدم صاحب پر اعتماد کرنے والوں پر مشتمل ہے۔ ایک بار پنڈت ہری چند اختر کچھ لوگوں کے ساتھ بحث کر رہے تھے فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے عدم پر اعتماد ہے۔ جو یہ فیصلہ دیں گے' مان لوں گا۔ ان کا خیال تھا عبدالحمید عدم صاحب ان کے حق میں فیصلہ دیں گے لیکن انہوں نے الٹ کر دیا تو دوسروں نے کہا "آپ نے عدم پر اعتماد کا اظہار کیا تھا' اب آپ کو یہ ماننا پڑے گا۔" تو ہری چند اختر نے کہا "میں نے تو عدم اعتماد کا اظہار کیا تھا۔" رابرٹ برٹن نے کہا ہے: انگلینڈ عورتوں کے لیے جنت اور گھوڑوں کے لیے جہنم ہے۔" سو انگریز طالب علم نے مضمون کا عنوان "گھوڑوں کا شکار" رکھا تو بات سمجھ میں آتی ہے لیکن پاکستانی طالب علم کے مضمون سے تو لگتا ہے پاکستان میں گھوڑوں کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک چل رہی ہے۔ حالانکہ ہمیں تو اس جانور میں کوئی ایسی خامی نظر نہیں آتی کہ اس کے خلاف ایسی بداعتمادی کی تحریک چلائی جائے۔ اگرچہ ہمارے ہاں یہ محاورہ ہے کہ گھوڑا اور عورت اس کی جس کے قبضے میں ہو۔ اس میں

بھی اتنا عدم اعتماد گھوڑے پر نہیں کیا گیا جتنا عورت پر کیا گیا ہے۔ ان فلیمنگ نے کہا ہے "گھوڑا وہ شے ہے جو دونوں سروں سے خطرناک اور درمیان سے بے آرام ہوتا ہے۔" ویسے یہ واحد جانور ہے جو جوتے بھی پہنتا ہے' ہر ماہ اس کے پاؤں میں نئے نعلین لگوانے پڑتے ہیں۔ پھر گھوڑا ہر زبان میں ہنہنا سکتا ہے مگر پھر بھی بے زبان ہوتا ہے۔ چارلس دی ایمپئیرر نے کہا کہ میں خدا سے ہسپانوی زبان' عورتوں سے اطالوی' مردوں سے فرانسیسی اور گھوڑوں سے جرمن زبان میں باتیں کرتا ہوں۔ یہ باتیں انہوں نے ایک سیاستدان سے جرمن میں بات چیت کرتے ہوئے کہیں۔

ایک بار ایک انگریز نے پطرس مرحوم سے کہا "سنا ہے برصغیر میں گدھے بہت ہوتے ہیں۔" تو پطرس مرحوم نے کہا "صاحب! ہوتے تو بہت تھے مگر 1947ء میں بیشتر یہاں سے شفٹ ہو گئے۔"

مغل بادشاہ بابر تو صرف اس بات پر عمر بھر فخر کرتا رہا کہ میرے آباؤ اجداد گھوڑے کی پیٹھ پر پیدا ہوئے۔ پھر گھوڑا نہ ہو تو کوئی پنجابی فلم نہیں بن سکتی کیونکہ جب تک سلطان راہی کو گھوڑے پر نہ بٹھاؤ' وہ ڈائیلاگ نہیں بول سکتا۔ ہمارے جاگیردار وڈیرے تو گھوڑوں پر اس لیے بھی بیٹھتے ہیں کہ ان پر بیٹھ کر وہ زمانہ قدیم کے انسان کی طرح چار ٹانگوں پر چل سکتے ہیں اور وہی کر سکتے ہیں جو چار ٹانگوں والے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں صرف ایک خاتون اول "ناہید خانم" ایسی گزری ہیں جنہیں جانور اس قدر ناپسند تھے کہ اپنے خاوند صدر سکندر مرزا سے اکثر کھنچی کھنچی رہتیں۔ یہاں تک کہ صدر صاحب نے ایک اے ڈی سی پر مشتمل کئی رکنی کمیٹی کی ڈیوٹی لگا دی کہ وہ سارا دن ایوان صدر سے کوے اڑایا کریں۔ ان دنوں گھوڑوں کی ایوان اقتدار تک پہنچ نہیں تھی'

اب گھوڑوں کو ہم نے وہ مقام دیا ہے جو شاید کبھی گھوڑوں نے بھی ہمیں نہ دیا ہو۔

امریکہ کی حکومت بدلنے میں جو رول "گدھے" کا ہے' وہی ہمارے ہاں گھوڑے کا ہے۔ سو جو بھی تحریک چلتی ہے' وہ انہیں اعتماد میں لے کر چلتی ہے۔ سو عدم اعتماد سے مراد ان پر عدم سے اعتماد ہو سکتا ہے۔ یوں بھی ہماری تاریخ گھڑ دور سے گزر رہی ہے۔

اس سے پہلے کے زمانے کو ابن انشاء یوں لکھتے ہیں:

- پتھر کا زمانہ

راہوں کا پتھر
جلسوں کا پتھر
سینوں میں پتھر
عقلوں پہ پتھر
پتھر ہی پتھر

- دھات کا زمانہ

چمچے ہی چمچے
سکے ہی سکے
سونا ہی سونا
چاندی ہی چاندی
لوہا ہی لوہا

- اور اب گھڑ دور

کوآپریٹو گھوڑے
تان کوآپریٹو گھوڑے
جیتنے والے گھوڑے
ہارنے والے گھوڑے
ہیروئن والے گھوڑے

گھوڑے ہی گھوڑے

○○○

• PAIN-TINGS

لیجئے صاحب! محمد حنیف رامے صاحب نے جو پینٹنگ 1968ء میں شروع کی تھی' وہ 23 سال بعد مکمل کر لی۔ سمجھ نہیں آتی انہیں پینٹنگ مکمل ہونے کی مبارکباد دیں یا اس قدر جلدی کرنے کی داد۔ ایک ایسے ہی شاعر نے کہا کہ میں نے یہ نظم 20 سال سوچنے کے بعد لکھی ہے تو نقاد نے کہا "واقعی اس پر تو داد دینے سے پہلے بھی 20 سال سوچنا پڑتا ہے۔" ویسے اس سے پہلے محمد حنیف رامے صاحب اس قدر جلدی تصویریں بناتے تھے کہ ایک بار ایک شخص نے انہیں کہہ ہی دیا کہ لگتا ہے یہ خاتون کی تصویر آپ نے بڑی جلدی میں بنائی ہے۔ رامے صاحب نے پوچھا "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" تو وہ بولا "اس لیے کہ آپ جلدی میں اسے کپڑے پہنانا بھول گئے ہیں۔" ایک خاتون نے ویسا ہی لباس پہنا تھا جو رامے صاحب پہلے اپنی تصویروں میں خواتین کو پہنایا کرتے تھے تو دیکھنے والے نے خاتون سے اس لباس کی تعریف کی۔ اس خاتون نے کہا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں۔" تو دیکھنے والے نے کہا "اسی لیے تو تعریف کر رہا ہوں۔" صاحب! رنگ دنیا کی ہر زبان بولتے ہیں لیکن رامے صاحب کی پہلی تصویروں کے رنگ بولتے نہیں بلاتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے جو تصویر 23 سالوں میں مکمل کی ہے' وہ حسب معمول عورت کی ہی ہے مگر یہ ان کی وہ تصویر ہے جو ننگی نہیں ہے۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ صرف چہرے کی ہے۔ انہوں نے دانشوروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا "یہ تصویر اتنی دیر میں اس لیے مکمل ہوئی کہ میں تصویر بنا رہا تھا کہ ایک بچے کے رونے کی آواز آئی اور میں نے قلم رکھ دیا۔" اگرچہ انہوں نے واضح نہیں کیا کہ اس وقت وہ کس کے گھر میں تھے۔ بہر حال انہوں نے تصویر آدھی چھوڑ دی اور باہر جا کر دیکھا تو رونے والا بچہ ایک نہیں۔ ہزاروں' لاکھوں بوڑھوں اور عورتوں کی آنکھوں

میں بھی آنسو ہیں، سو فیصلہ کیا کہ ان کو جب تک مسکراہٹیں نہ دے دوں، میں قلم کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔ سو یہ پتہ نہیں چلا کہ انہوں نے ہاتھ لگائے بغیر یہ تصویر کیسے مکمل کر لی۔ ہمیں تو لگتا ہے گزشتہ 23 سال سے ہمارے ملک میں جو کچھ ہوا، دراصل وہ رامے صاحب کو یہ تصویر بنانے سے روکنے کے لیے ہی تھا۔ کبھی بہانے بہانے سے انہیں وزیر اعلیٰ ہاؤس میں رکھا جاتا اور کبھی شاہی قلعے میں۔ ہو سکتا ہے جیسے پارٹیاں یہ کریڈٹ لیتی ہیں کہ ہم نے کالا باغ ڈیم نہیں بننے دیا، کوئی پارٹی یہ کریڈٹ بھی اپنے ذمے لے لے کہ ہم نے 23 سال یہ تصویر نہ بننے دی۔

ویسے یہ تصویر چونکہ لڑکی کی ہے، سو ہو سکتا ہے اسے 1968ء میں شروع کر کے رامے صاحب 23 سال اس کے جوان ہونے کا انتظار کرتے رہے ہوں۔ انہوں نے تصویر کا نام "پاکستان" رکھا ہے۔ جس میں خاتون کے ہونٹ سلے اور ماتھے پر پسینہ ہے۔ جو بنانے سے پہلے مصور کے ماتھے پر تھا، اب دیکھتے وقت ناظر کے ماتھے پر ہوتا ہے۔ آنکھوں میں خون کے آنسو اور ناک میں نتھ ہے۔ یوں انہوں نے پاکستان کو نتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تصویر ہماری حالت پر طنز ہے۔ سو ہو سکتا ہے بنانے میں جو 23 سال لگے، وہ بھی طنز ہی ہوں کہ ہم ایسے کاموں پر بھی اتنے سال لگا دیتے ہیں۔ ایک لڑکا سرکاری افسر کے پاس ملازمت کے لیے گیا تو افسر نے کہا "آپ ڈاکومنٹ دے جائیں، ہم آپ کو کال بھیج دیں گے کیونکہ ہمیں اس سیٹ پر بوڑھا آدمی چاہیے۔" تو لڑکے نے کہا مگر میں تو ابھی صرف پچیس برس کا ہوں تو افسر بولا "پریشانی کی کوئی بات نہیں، جب تک کال پہنچے گی تو مطلوبہ عمر کو پہنچ چکے ہو گے۔"

محمد حنیف رامے صاحب نام کے ساتھ رامے کیوں لکھتے ہیں؟ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ گفتگو میں سب کو رام کر لیتے ہیں یا کوئی "اور" تعلق ہو سکتا ہے۔ جیسے مولانا محمد علی جوہر نے سیتاپور میں ایک کھانے کی دعوت پر مہاتما گاندھی سے کہا کہ میں یہ سب سسرال کا مال سمجھ کر کھا رہا ہوں۔ مہاتما گاندھی نے کہا "کیسے؟" بولے "میں رام پور کا ہوں اور یہ سیتاپور ہے۔ رام اور سیتا کے رشتے کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔"

رائے صاحب بیٹھے ہوں تو مصور کم اور تصور زیادہ لگتے ہیں بلکہ اپنی ہی پینٹنگ کے ساتھ کھڑے ہوں تو لگتا ہے انہوں نے یہ پینٹنگ نہیں بنائی' پینٹنگ نے انہیں بنایا ہے۔ پینٹنگ کے لیے سب سے پہلے "پین' یعنی درد چاہیے ہوتا ہے۔ اگر یہ درد پینٹر میں نہ ہو تو دیکھنے والے کو ہو جاتا ہے۔ رائے صاحب سیاست دان بھی ہیں۔ ایک بار ایک مصور نے سیاستدان کی تصویر بنائی۔ دیکھنے والے نے کہا "یہ تو ان سے بالکل نہیں ملتی' اتنا فرق کیوں ہے؟" تو مصور نے کہا "دراصل یہ میں نے اس وقت بنائی' جب وہ سچ بول رہے تھے۔"

رائے صاحب اس قدر نرم دل ہیں کہ جسے نہ دے سکیں' اسے خطاب ہی دے دیتے ہیں۔ کسی کو اپنا ہم عصر نہیں مانتے لیکن جب ان پر مذہبی غلبہ ہوا تو اس وقت جو ساتھ عصر کی نماز پڑھ لیتا' اسے بھی ہم عصر کہتے۔ وہ وزیراعلیٰ پنجاب تھے تو آرٹ کے ایک نقاد نے ان کی تصویریں دیکھنے کی ضد کی اور ایک پینٹنگ دیکھ کر کہنے لگا "یہ تجریدی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔" تو رائے صاحب نے کہا "یہ تصویر نہیں' وہ تو اندر گیلری میں ہے۔ اس کینوس پر تو میں نے برش صاف کیے تھے۔" ویسے بھی تجریدی آرٹ وہ ہوتا ہے جس میں نقاد مصور کو بتاتے ہیں کہ اس نے کیا بنایا ہے؟ کسی نے تجریدی مصوری کی یوں تعریف کی کہ وہ تصویر جسے آپ دیوار پر اکھڑے پلستر کو چھپانے کے لیے لگائیں تو لگانے کے بعد آپ کا یہ فیصلہ ہوا کہ اکھڑا پلستر بہتر لگتا تھا۔ جب سے وہ پکاسو کی بیوہ سے ملے ہیں نقادوں نے تو رائے صاحب کو پکاسو" کا ہم پلہ بلکہ ہم پلو قرار دے دیا ہے۔ ویسے تو ہم بھی کہتے ہیں کہ محمد حنیف رامے ایک لحاظ سے پکاسو سے بہتر ہیں کہ وہ ابھی زندہ ہیں۔

امبروز بائی ایریک سے کسی نے پوچھا "پینٹنگ بنانے کا فائدہ؟" کہا "پینٹنگ کینوس کی سطح کو مختلف موسمی اثرات سے بچاتی ہے اور نقادوں کو مصروف رکھتی ہے۔"

ہمیں رامے صاحب کی صرف ان تصویروں میں عورتیں نظر نہیں آئیں جو ہم نے نہیں دیکھیں' وہ تو پانی کی تصویر بھی بنائیں تو عورت کی بن جاتی ہے۔ وہ بھی ایسی کہ دیکھنے

والا پانی پانی ہو جاتا ہے۔ کیا دنیا میں پہلی تصویر کسی عورت کی بنی؟ اتنا تو پتہ نہیں البتہ یہ علم ہے کہ دنیا میں پہلی تصویر ایک عورت نے بنائی۔ جب مرد شکار کے لیے جاتے تو عورتیں غار کی دیواروں پر شکار کیے جانوروں کے دانتوں سے نقش بناتیں۔ اندازہ کر لیں، تجریدی آرٹ کا ماضی کتنا تابناک ہے۔ آسکر وائلڈ کہتا ہے۔ "وہ پورٹریٹ جسے مصور ڈوب کر بنائے، دراصل وہ سامنے بیٹھے ماڈل کی نہیں بلکہ بنانے والے کی اپنی ہوتی ہے۔" رامے صاحب نے پاکستان کی یہ تصویر بھی اس طرح جذب ہو کر بنائی ہے۔ سو ہو سکتا ہے انہوں نے یہ پاکستان کی بجائے اپنی تصویر بنا دی ہو، شاید اسی لیے یہ تصویر زنانہ ہے۔

○○○

(ریٹائرڈ) جنرل نالج صاحب

اگرچہ نالج کے ساتھ جنرل کا اتنا ہی تعلق ہے کہ جس بات کا ہر کسی کو علم ہونا چاہیے' وہ جنرل نالج کہلاتی ہے۔ گزشتہ دنوں ایک پولیس آفیسر نے کہا کہ میں آپ کے جنرل نالج میں اضافے کے لیے بتا رہا ہوں کہ انگلستان کی آبادی پنجاب کی آبادی کے برابر ہے لیکن سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 1990ء میں انگلینڈ میں پانچ لاکھ کیس رجسٹرڈ ہوئے جبکہ پنجاب میں درج ہونے والے جرائم کی تعداد پچاس ہزار رہی۔" صاحب! پولیس والوں کو عادت ہے کہ وہ ہر کام ڈرا دھمکا کر کرتے ہیں' سو انہوں نے نالج دینے کے لیے بھی ساتھ جنرل کا لفظ لگا دیا کیونکہ جنرلوں کی بات ہمیں فوراً مان لینے کی عادت ہے۔ اگرچہ جنرلوں کے نالج کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ایک بار جنرل ٹکا خان صاحب نے کاغذ پر جنرل نالج لکھا دیکھا تو پوچھا "یہ کون جنرل ہے' ہم اس کو نہیں جانتا۔" یہ الگ بات ہے کہ وہ تو خود کو بھی نہیں جانتے۔ ایک بار وہ کسی جنرل سٹور پر گئے' اپنی مطلوبہ چیزیں مانگیں تو سٹور والے نے کہا "ہمارے پاس فوجی مصنوعات نہیں ہوتیں۔" تو بولے "اگر جنرلوں کی چیزیں نہیں رکھیں تو پھر اس کا نام جنرل سٹور کیوں رکھا؟" بہرحال پولیس آفیسر نے ہمیں ہی جنرل نالج 1990ء کا دیا ہے یعنی آپ اسے ریٹائرڈ جنرل نالج کہہ سکتے ہیں لیکن یاد رہے کہ جنرل ریٹائرڈ کم ہی ہوتے ہیں' ہمیشہ اپنے مقام پر قائم رہتے ہیں بلکہ ہمارے ہاں تو قائم مقام ہی رہتے ہیں۔

اگرچہ پولیس کو ہمارے جنرل نالج میں اضافہ کرنے کی بجائے اپنے کیسوں میں اضافہ کرنا چاہیے تھا کہ دوسری قومیں لاکھوں پر پہنچ گئیں اور ہم ابھی ہزاروں پر ہی ہیں۔ ویسے جرائم تو ہمارے ہاں دنیا میں سب سے زیادہ ہوتے ہیں لیکن درج ہونے کی وجہ شاید یہ ہو کہ ہمارے ہاں انگلینڈ کی طرح ہر ایرے غیرے کا کیس درج نہیں کیا جاتا۔

پرچہ میرٹ پر کٹتا ہے اور میرٹ بھی اس قدر سخت کہ ایک بار رانا پھول صاحب ایک ایم ایس سی لڑکی کو ملازمت دلانے کے لیے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کے پاس لے کر گئے تو وزیر اعلیٰ صاحب نے کہا کہ اسے ملازمت نہیں مل سکتی کیونکہ یہ میرٹ پر پوری نہیں اترتی تو رانا پھول صاحب نے کہا "میں چٹا ان پڑھ وزیر ہوں' جو میٹرک ہے وہ وزیر اعلیٰ ہے اور بی اے وزیراعظم ہے۔ واقعی اس ملک میں ایم ایس سی کے لیے میرٹ پر کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔" یہاں تو ایم این اے اور ایم پی اے اتنا کچھ کرتے ہیں' ان کے کیس رجسٹرڈ نہیں ہوتے' وہاں عام آدمی میرٹ پر کیسے آ سکتا ہے؟ اس میں پولیس کی کام چوری کو دخل نہیں۔ ویسے بھی ہماری پولیس کام چور ہرگز نہیں۔ ایک بار منور ظریف صاحب نے کسی کا کام نہ کیا تو اس شخص نے آ کر کہا "آپ بڑے کام چور ہیں۔" تو منور ظریف نے کہا "آپ مجھ پر یونہی چوری کا الزم لگا رہے ہیں۔ قسم لے لیں آپ کے کام کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

ویسے بھی ہماری پولیس کا انگلستان کی پولیس کی کارکردگی سے موازنہ نہیں ہو سکتا۔ جدید ساز و سامان ہونے کے باوجود ہماری پولیس انگلینڈ والوں کی پولیس سے "اڈوانس" ہے۔ وہ واردات کے آدھا گھنٹہ بعد جا کر پتہ چلاتے ہیں کہ اس میں کس کا ہاتھ ہے؟ ہماری پولیس کو واردات سے آدھ گھنٹہ پہلے پتہ ہوتا ہے۔ پھر بھی انگریز اور پاکستانی کی نفسیات میں فرق ہے۔ انگریز ٹرین سے اترتا ہے تو مڑ کر دیکھتا ہے کہ اس کا سامان ٹرین میں تو نہیں رہ گیا۔ آئرلینڈ کا باشندہ ٹرین سے اتر کر دیکھے گا کہ کسی کا سامان تو نہیں رہ گیا۔ امریکی بغیر دیکھے اتر کر اپنی منزل کی طرف چل پڑے گا جبکہ پاکستانی جب اترے گا تو سب سے پہلے اپنے سامان کی طرف دیکھیں گے۔ پولیس آفیسر نے انگلستان سے موازنہ شاید اس لیے کیا ہو کہ وہاں بھی جرم کی تعریف وہی ہے جو ہمارے ہاں ہے۔ ڈیوڈ فراسٹ کہتا ہے "انگلینڈ میں جرم کی وسیع معنوں میں تعریف یہ ہے کہ نچلے طبقے کی ہر وہ سرگرمی جس سے اپر کلاس خوش نہ ہو جرم ہے۔" پھر انگلینڈ میں

تو جب تک کوئی تعارف نہ کرائے' پولیس مجرم سے ہمکلام نہیں ہوتی جبکہ ہمارے ہاں یہ حالت ہے کہ ایک حوالدار نے مجرم سے کہا "اوئے! تم پھر کیوں آئے ہو؟" تو اس نے کہا "میں یہ پتا کرنے آیا ہوں کہ میرا کوئی خط تو نہیں آیا کیونکہ میں نے تھانے کا پتہ دیا ہوا ہے۔" ان حالات میں تو ہمارے ہاں کیس سب سے زیادہ رجسٹر ہونے چاہئیں تھے۔ ہو سکتا ہے پولیس کہے کہ اتنے کم کیس اس لیے درج ہوئے کہ عوام ہم سے تعاون نہیں کرتے۔ حالانکہ اگر عوام "تعاون" کرتے تو یہ کیس پانچ ہزار سے بھی کم ہوتے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے اس قدر کم کیس درج ہونے کی وجہ سٹیشنری کی کمی ہو۔ ممکن ہے ہمارے محرروں کو اس سے زیادہ گنتی ہی نہ آتی ہو' وہ پچاس ہزار کے بعد پھر ایک سے شروع ہو جاتے ہوں۔ ویسے اگر پولیس والے ان پڑھ ہوتے تو زیادہ کیسوں کا اندراج ہوتا۔ ایک بار عطااللہ شاہ بخاری صاحب نے کہیں کہہ دیا کہ حکومت لاشے ہے تو ان پر مقدمہ درج ہو گیا کہ مبینہ "لاشوں" کی برآمدگی کراؤ اور بخاری صاحب کو بچنے کے لیے بتانا پڑا کہ "لا" کا مطلب "نہیں" ہوتا ہے اور لاشے کا مطلب "کوئی شے نہیں۔"

ایک دانشور نے کہا "پاکستان میں صرف دو قسم کے لوگ جرائم کرتے ہیں۔" پوچھا "کون کون؟" فرمایا۔" ایک مرد اور دوسرا عورتیں۔" ویسے پاکستان سے جرم کو حرف غلط کی طرح مٹانا کوئی مشکل نہیں' آپ تھانوں کو ہتھکڑیوں کی بجائے انک ریمور بھجوائیں تا کہ جہاں جرم لکھا نظر آئے' اسے مٹاتے جائیں یا اگر صوبے میں جرائم کی کمی کرنا ہے تو اس کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آپ پنجاب اسمبلی کے ارکان کی تعداد میں کمی کر دیں۔ جیسے ایک ادیب نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا کہ میں یہ کتاب اپنی بیوی کے تعاون کے بغیر اس سے آدھے وقت میں لکھ سکتا تھا۔ ایسے ہی جتنے جرائم آپ سال میں پولیس کی مدد سے کم کر سکتے ہیں' اتنے آپ پولیس کی مدد کے بغیر آدھے وقت میں کم کر سکتے ہیں لیکن صاحب! اگر جرم اسی طرح کم ہوتے رہے تو

چند سال بعد تھانوں میں کوئی کیس درج ہی نہ ہو گا تو پھر تھانوں کا کیا استعمال رہ جائے گا؟ سو تھانوں کو بیکار بنانے سے بچانے کے لیے پولیس والوں کو اپنی کار ناکردگی میں اضافہ کرنا چاہیے تاکہ حکومت اور تھانے کھول سکے۔ ویسے ہو سکتا ہے کہ پولیس نے جن پچاس ہزار کیسوں کا ذکر کیا ہے' وہ پولیس کے خلاف درج کرائے گئے ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کالم کے بعد ان میں اضافہ ہو گا۔ جیسے ایک بادشاہ کسی بزرگ کے پاس گیا کہ میری بخشش کی دعا کریں۔

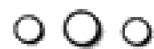
بزرگ نے پوچھا "کیوں؟"

"میں نے پندرہ قتل کیے ہیں۔" بادشاہ بولا۔

بزرگ نے کہا "تم ظالم ہو اور ظالم کے لیے میں دعا نہیں کرتا۔"

تو بادشاہ نے کہا "سولہ۔"

سو یہ نہ ہو' وہ آفیسر ہمارا کالم پڑھنے کے بعد کہیں "پچاس ہزار ایک!"



• مس نون اور مس آفٹر نون

اداکارہ مدیحہ شاہ نے کہا ہے کہ میری وہ فلمیں ہٹ ہوتی ہیں جو "ن" سے شروع ہوتی ہیں۔ ہم سمجھتے رہے کہ فلم میں الف ہونا ہی اداکاراؤں کی کامیابی کی ضمانت ہے' اب نون ہونا بھی کامیابی کی ضمانت بن گیا ہے۔ اگرچہ فلموں میں ہیروئن کا نون غنہ ہونا پہلے بھی ضروری تھا۔ حروف تہجی میں سے "ن" وہ حرف ہے کہ جس لفظ کے شروع میں لگے' اس لفظ پر حرف آتا ہے وہ منفی یعنی "ناں" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فلمی اداکاراؤں کی خوش قسمتی اس سے پہلے "ناں" میں تو نہیں "ہاں" میں ہوتی تھی۔ پھر فلم انڈسٹری میں نون کے فوراً بعد آفٹرنون آ جاتا ہے۔ سو دو منٹ پہلے جو مس نون ہوتی ہے' وہ مس آفٹر نون بن چکی ہوتی ہے۔ اس سے قبل فلمی حلقوں میں جو حروف تہجی مقبول تھے۔ وہ "بے لفظ" ہی ہوتے تھے۔ پہلی بار ایسا حرف آیا ہے جس کے گرد نقطہ نہیں بلکہ یہ خود نقطے کے گرد ہے۔ غیر فلمی اداکار یعنی سیاستدان بھی حروف تہجی استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے ایک وزیر باتدبیر کے پی اے نے ضروری فائلیں میز پر رکھیں تو وزیر صاحب نے پوچھا کہ کیا کرنا ہے؟ پی اے نے کہا "سر آپ اس پر Seen لکھ کر دستخط کر دیں گے۔" تو انہوں نے "س" لکھ کر دستخط کر دیے۔ اب تو وہ دستخطوں کی بھی ڈکٹیشن دینے لگے ہیں۔

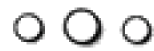
اس سے قبل شو بزنس میں کمال احمد رضوی صاحب کے الف نون کی کامیابی کی وجہ "نون" تھا۔ اب مدیحہ شاہ کے لیے بھی کامیابی کی وجہ قرار پایا ہے۔ جیسے سلطان راہی کے خون میں اداکاری شامل ہے اور ان کی اداکاری میں بھی خون شامل ہے۔ ایسے ہی مدیحہ شاہ کی اداکاری میں خوبصورتی اور خوبصورتی میں اداکاری شامل ہے۔ اتنی اچھی پرفارمر ہے کہ فلم میں ولن سے بچاؤ کے لیے پکارے تو فلمساز تک بچانے کو دوڑتے ہیں۔ اس قدر خوشی سے فلموں میں کام کرتی ہے کہ رونے والے سین بھی خوش ہو کر کرتی ہے۔

بابرہ شریف کی طرف خود کو سکینڈلوں کی بجائے سینڈلوں سے اونچا رکھتی ہے۔ مدیحہ شاہ دیکھنے میں ایسی ہے کہ ایک شخص ڈاکٹر کے پاس آنکھیں چیک کرانے گیا تو ڈاکٹر نے اسے ایک کارڈ دکھایا۔ اس شخص نے اسے 8 پڑھا تو ڈاکٹر نے کہا "تمہیں تو عینک کی سخت ضرورت ہے۔ یہ 8 نہیں' مدیحہ شاہ ہے۔"

فلمیں ہمارے معاشرے کی نہیں' ہمارے ذہنوں کی عکاسی کرتی ہیں۔ سر رالف رچرڈسن نے کہا ہے "اداکاری کیا ہے؟ بس لوگوں کو کھانسنے سے روکنے کا نام۔" ہمارے ہاں تو کھانسی معاشرتی ادب و آداب میں شامل ہے' آج بھی شرفاء خواتین والے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے نہ کھانسنے والے کو غیر مہذب سمجھتے ہیں۔ ہم جیسوں کی بھی بے پردہ خواتین کو دیکھتے ہی کھانسی نکل جاتی ہے۔ یوں کھانسی کی وجہ سے کبھی پوری پشتو فلم نہیں دیکھ پائے۔ اداکارائیں ہم لوگوں کے تین گھنٹے لینے کے لیے کئی ماہ دن رات ایک کرتی ہیں' دن کو رات اس لیے کرتی ہیں کہ بقول فلم سٹار محمد علی "فلم ڈویلپ بھی اندھیرے میں ہوتی ہے اور دیکھی بھی اندھیرے میں جاتی ہے۔" اس لیے اداکارائیں دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہیں۔ ویسے اداکارہ فلم نہیں بناتی' فلم اداکارہ کو بناتی ہے۔ فلم کی دنیا کی ہر بات الٹ ہے۔ عام زندگی میں ہم دعا دیتے ہیں۔ "خدا کرے تمہاری بڑی عمر ہو۔" جبکہ فلم میں کہتے ہیں "خدا کرے تم ہمیشہ چھوٹی عمر کی رہو۔" وہاں کے لوگ اس قدر توہم پرست ہیں کہ ایک بھارتی اداکارہ کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ میری وہ فلم سپرہٹ ہوتی ہے جو ان دنوں ریلیز ہو جب میں ہنی مون پر گئی ہوئی ہوں۔ سو انہوں نے اس طرح اپنی سات فلمیں ہٹ کرائیں۔ دور کیا جانا ہمارے اداکار دوست جو آج کل بی اے کے چوتھے سال میں ہیں' کہتے ہیں "جب بھی میں بی اے کا انگریزی کا پرچہ دیتا ہوں' میرا پرائزبانڈ نکل آتا ہے لیکن اس بار ڈر ہے کہ حاسدین مجھے پاس نہ کروا دیں۔"

میڈم نور جہاں سے ایک گلوکارہ نے کہا "میڈم آپ گاتے وقت انگلی پر ساڑھی کا پلو

لپیٹتی ہیں' اس لیے آپ کے گانے ہٹ ہوتے ہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آتی' میں گاتے وقت دونوں ہاتھوں سے کیا کیا کروں۔" تو میڈم نے کہا "تم گاتے وقت اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ لیا کرو۔" غیر فلمی اداکار یعنی سیاستدان تک اتنے شکی القلب ہیں کہ بھارتی وزیراعظم نرسیما راؤ کو کسی سوامی نے کہا "جس دن پوجا کے لیے جایا کرو' اس دن کسی ظالم کا چہرہ نہ دیکھا کرو۔" تو نرسیما راؤ نے کہا "سوامی جی! آپ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ شیو کیے بغیر جایا کرو۔" صاحب دوسروں کی کیا کہیں' ممتاز فلمی شاعر محسن نقوی صاحب تک سمجھتے ہیں کہ اگر ان کا راستہ بلی کاٹ جائے تو وہ جس کام کے لیے جا رہے ہوں' تو وہ نہیں ہوتا۔ ہمیں ان کی اس بات پر حیرانی نہیں' ہم تو اس پر حیران ہیں کہ وہ جیسا سمجھتے ہیں' ویسے ہی ہوتا ہے۔ سو فلم انڈسٹری میں ایسا سمجھا جانا کون سی نا سمجھی ہے۔ امریکی مزاح نگار رول راجرز نے کہا ہے کہ صرف ایک چیز فلم انڈسٹری کو مار سکتی ہے وہ ہے تعلیم' جس سے ہمیں تسلی ہے کہ پوری دنیا کی فلم انڈسٹری مر بھی گئی تو ہماری پھر بھی زندہ رہے گی۔



• بھارتی شعر انگیزی

ہماری کم علمی کا اس سے اندازہ کر لیں کہ ہمیں یہ راز آج تک معلوم نہ ہوا کہ پاک بھارت تعلقات کیوں ٹھیک نہیں ہو رہے۔ یہ تو ہمیں خانیوال کے قلزم بشیر صاحب نے بتایا جو ایسی معلومات کے بحیرہ قلزم ہیں۔ ان کی اطلاع کے مطابق کئی برسوں سے بھارت کی ایک شاعرہ اور پاکستانی شاعر شوکت مہدی صاحب کا ایک شعر پر تنازعہ چلا آ رہا ہے۔ طرفین ایک دوسرے پر الزام لگاتے رہے ہیں۔ ہم نے سوچا' زیادہ سے زیادہ یہی الزام ہو گا کہ خاتون کہتی ہوں گی۔ "یہ شعر میرا نہیں' شوکت مہدی صاحب کا ہے۔" جبکہ شوکت مہدی کہتے ہوں گے "یہ سراسر مجھ پر تہمت ہے۔" لیکن صاحب یہاں تو معاملہ ہی الٹ نکلا۔ ہر کوئی اس شعر کو اپنا "اٹوٹ انگ" ظاہر کر رہا ہے۔ قلزم بشیر صاحب نے جتنے خط لکھ کر ہماری توجہ اس نزعی مسئلہ کی طرف مبذول کرائی ہے۔ اس سے تو ہمیں لگنے لگا ہے کہ جب تک پاکستان اور بھارت کے درمیان یہ اہم شعری تنازعہ حل نہیں ہو جاتا' اس خطے میں پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔

بھارت کی شعر انگیزیاں تو اسی دن سے شروع ہیں' جب سے پاکستان بنا ہے۔ مشہور شاعر سیماب اکبر آبادی ایک مرتبہ نہال نیوھاروی سے شکایتاً کہہ رہے تھے کہ ملک کی تقسیم میں پاکستان کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ خزانے سے کچھ نہ ملا اور اسلحے کی تقسیم بھی منصفانہ نہیں ہوئی۔ نہال صاحب بولے "آپ سچ فرماتے ہیں شاعروں کا بٹوارہ ہی دیکھ لیجئے' بڑے بڑے شاعر ہندوستان میں رہ گئے اور پاکستان کے ہاتھ ہم آئے یا آپ۔" لیکن قیام پاکستان کے بعد ہمارے شعراء نے بھارت کو "سنانے" کے لیے شعری یلغار شروع کر دی۔ ایک ایسے ہی بزرگ شاعر جب قریب المرگ ہوئے تو کہنے لگے "میں ہندوستان جاؤں گا۔" کسی نے کہا "بھارت دشمن ملک ہے' آپ وہاں کیوں جانا چاہتے ہیں؟" بولے "مر تو مجھے جانا ہی ہے' سوچا ہندوستان جا کر مروں تاکہ ان کا ایک اچھا

شاعر تو کم ہو۔" لیکن اب تو بھارت نے ہمارے شعراء کے بجائے شعروں پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیئے ہیں۔ شوکت مہدی صاحب تو کہتے ہیں "موصوفہ نے میرا شعر چرایا ہے۔" اگرچہ انہوں نے اس چوری کی مقامی تھانے میں رپٹ درج نہیں کرائی کیونکہ اس سے پہلے ایک شاعر نے تھانے جا کر کہا "میرا شعر چوری ہو گیا ہے۔" تو محرر نے کہا "شیر چوری ہو گیا...... اوئے! تمہیں آبادی میں شیر رکھنے کی اجازت کس نے دی تھی؟" اور شاعر کو نقص امن میں اندر کر دیا۔ یوں تو ہمارے ہاں اس قدر چوریاں ہوتی ہیں کہ ایک تجزیہ نگار نے کہا "اس سال فروری کے مہینے میں سب سے کم چوریاں ہوئیں۔" کسی نے پوچھا "اس کی وجہ؟" تو بولا "اس کی وجہ یہ ہے کہ فروری کے مہینے کے دن سب سے کم ہوتے ہیں۔" لیکن ایسی شعری چوری کم ہی سننے میں آتی ہے۔

چوری اور اردو شاعری دونوں لازم و ملزوم ہیں بلکہ ہمیں تو اردو شاعری چوریوں کے خلاف درج رپٹ ہی لگتی ہے جس میں محبوب دل' سکون' نیند اور دوسری چیزوں کے علاوہ آنکھیں تک چراتا ہے۔ ذرا سوچیں۔ اگر محبوب کو چوری کی یہ عادت نہ ہوتی تو ادب کا کیا رہ جاتا۔ اختر شیرانی صاحب سے پہلے ادب میں مرد چور زیادہ تھے کیونکہ محبوب سے مراد اکثر مذکر ہی لیا جاتا۔ اختر شیرانی صاحب نے "سلمٰی" کو لا کر محبوب کو مونث بنا دیا۔ تب سے اردو شاعری چور خواتین یعنی محبوباؤں کی وجہ سے چل رہی ہے۔ شاید اسی لیے شوکت مہدی صاحب کا شعر چرانے کے لیے بھی خاتون ہی آگے آئیں کیونکہ چور شاعر کبھی پسند نہیں کیا گیا۔ صاحب شاعری تو شاعر کی مونث ہوتی ہے جس سے اندازہ لگا لیں' کسی کا شعر چرانا کتنی بڑی بات ہے۔ اس پر تو مہا بھارت چھڑ سکتی ہے۔ ایسی حرکت پر کڑی سزا ملنا چاہیے' جیسے انگلینڈ میں ایک شاعر اپنے دوست کی بیوی بھگا کر لے گیا تو اس دوست نے عدالت سے درخواست کی کہ اس شاعر کو سخت سزا دی جائے اور عدالت نے ایسا ہی فیصلہ دیا جو یہ تھا کہ وہ عورت اب شاعر کے ساتھ ہی رہے گی۔

اگرچہ پتہ نہیں چلا کہ شعر چرانے میں اس اکیلی شاعرہ کا ہاتھ ہے یا بھارتی حکومت بھی اس میں شریک ہے۔ ایک ایسے چور سے جج صاحب نے پوچھا "تم نے اکیلے اتنی بڑی چوری کیوں کی؟" تو چور نے کہا "جناب' اس دور میں ایماندار ساتھی کہاں سے ملتے ہیں؟" لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس شاعرہ نے ہو بہو ویسا شعر کہا ہو جیسا شوکت مہدی کا ہے۔ سو ہماری تو یہ رائے ہے کہ شوکت مہدی صاحب شعر کا بٹوارہ کر لیں اور ایک مصرع لے لیں تا کہ خطے میں کشیدگی کم ہو ورنہ ہمیں تو ڈر ہے' کہیں یہ خاتون کل یہ اعلان نہ کر دے کہ اصلی شوکت مہدی تو میں ہوں۔ پچھلے دنوں ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر بیٹھے ڈاک دیکھ رہے تھے کہ ایک نوجوان نے آ کر اپنی نظم دی۔ ایڈیٹر صاحب نظم پڑھتے رہے اور تعریف کرتے رہے' نظم ختم ہوئی تو پوچھا "یہ نظم آپ کی ہے؟" نوجوان نے کہا "ہاں۔" ایڈیٹر صاحب نے احتراماً کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "پھر تو اختر شیرانی صاحب آپ تشریف رکھیں' مجھے آپ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کیونکہ 41 برس سے اس غلط فہمی میں تھا کہ آپ کی وفات حسرت آیات ہو چکی ہے۔" سو ہو سکتا ہے جو لوگ جانتے ہیں کہ شعر شوکت مہدی کا ہے' وہ خاتون سے یہ شعر سن کر پوچھیں۔ "یہ شعر آپ کا ہے؟" وہ کہیں "ہاں" تو سننے والے کہیں' آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ ہم آج تک یہی سمجھتے رہے کہ شوکت مہدی مرد ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دن کسی اخبار میں یہ شعر چھپے اور نیچے لکھا ہو' اس شعر کی خالق امید سے ہیں اور لوگ شوکت مہدی کو میٹرنٹی ہسپتال میں ڈھونڈ رہے ہوں۔

○ ◯ ○

• خسرہ کنونشن

ہمارے نام کے ساتھ ڈاکٹر پڑھ کر ہو سکتا ہے آپ سمجھیں کہ ہم کسی میڈیکل کنونشن کا ذکر کرنے والے ہیں جس میں خناق اور خسرہ جیسے امراض کا ذکر ہو گا۔ نہیں صاحب! یہاں ہمارا اشارہ اسلم ہیجڑا صاحب کے خسرہ کنونشن کی طرف ہے۔ یاد رہے کہ ہم نے اشارہ اسلم ہیجڑا صاحب کی طرف نہیں کیا کیونکہ ایک بار ہم نے ان کی طرف اشارہ کر دیا تو کہنے لگے "آپ کو سر عام اشارے کرتے شرم آنا چاہیے۔" ایک بار وہ اپنے ہم عمر ہیجڑے کے ساتھ گاڑی میں جا رہے تھے' کانسٹیبل نے چوک میں رکنے کا اشارہ کیا تو نہ رکے۔ ساتھی نے کہا "گرو! آپ اشارے پر کیوں نہیں رکے؟" تو کہا "رانی! اب ہماری عمر ہے' اشاروں پر رکنے کی!" لیکن اب انہوں نے سب ہیجڑوں کو اپنے حقوق کے لیے کھڑے ہو جانے کا اشارہ دے دیا ہے کیونکہ ان کے جملہ حقوق ہنوز غیر محفوظ چلے آ رہے تھے۔ ان کا اشارہ پاتے ہی کچھ ہیجڑے تو اٹھ کھڑے ہوئے اور باقی اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ ایک بار اسلم ہیجڑا صاحب بس میں سفر کر رہے تھے تو کسی نے پوچھا تھا "اگر خواتین اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑی ہوں تو کیا ہو؟" وہ تالی بجا کر بولے "ہو گا کیا' بس میں اپنی سیٹ گنوا بیٹھیں گی۔" لیکن اب انہوں نے خود بھی وہ کام شروع کر دیا ہے۔ ہمیں تو پہلے ہی فکر تھی کہ عورتوں کو یہ ثابت نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مردوں سے کسی لحاظ سے کم ہیں اور ہر کام ان سے بہتر کر سکتی ہیں کیونکہ مردوں کو اگر اس کا پتہ چل گیا تو وہ سارے کام انہی سے کرایا کریں گے۔ اب یہی غلطی اسلم ہیجڑا صاحب کر رہے ہیں۔

ہمارے ہاں تو خسرہ کی جمع خسارہ ہی ہو سکتی ہے۔ بہرحال اسلم صاحب خسرہ کنونشن کے ذریعے اس "تیسری دنیا" کو جمع کرنا چاہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس کی صدارت کے

لیے صدر بش صاحب کو موقع دیں کیونکہ "تیسری دنیا" کی انہیں بڑی فکر ہے۔ ہمیں تو یہ کنونشن نیو ورلڈ آرڈر ہی کا حصہ لگتا ہے۔

مقامی سیاست میں تو پہلے ہی بڑی مدت سے تیسری قوت کی ضرورت کا ذکر ہو رہا تھا۔ سو اب تیسری قوت میدان میں آ کودی ہے اور پھر ان سے زیادہ "کودنے" کا تجربہ اور کس کو ہو سکتا ہے۔ یوں اب ہماری سیاست میں ون ٹو ون مقابلہ نہ ہو گا بلکہ "ٹو ان ون" سے مقابلہ ہوا کرے گا۔

اسلم خسرہ صاحب نے ترکی کو بھی دھمکی دیدی ہے کہ وہ وہاں کے ہیجڑوں پر آزار بند کریں۔ لیکن کہا اس انداز سے ہے کہ لگتا ہے' کہہ رہے ہوں' ترکی ہیجڑوں کو آزاد بند دے۔ ویسے اسلم خسرہ صاحب نے بڑی مردانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزید کہا ہے کہ اگر ترکی باز نہ آیا تو اسے سزا دینے کے لیے ہم اتحادی فوجوں کو پھر سے حملے کا حکم دے دیں گے۔ اگرچہ اس سے تو لگتا ہے' وہ سزا ترکی کو نہیں' اتحادی فوجوں کو دینا چاہتے ہیں۔ تاہم انہوں نے ترکی کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے ترکی سیکھنی شروع کر دی ہے۔ پچھلے الیکشن میں وہ صوبائی اسمبلی کی سیٹ پر کھڑے ہوئے اور کھڑے ہی رہے۔ ان دنوں خسروں نے ایبٹ آباد میں اعلان کیا "ہم کل جلوس میں اہم مسئلہ اٹھائیں گے۔" اور اگلے دن ہزاروں کا جلاس نکالا' جنہوں نے اسلم خسرہ صاحب کو اٹھایا ہوا تھا۔ اسلم صاحب بول رہے ہوں تو یوں لگتا ہے' بول رہی ہیں۔ صوبائی حکومت کو "سوبائی" حکومت کہتے ہیں۔ مالی حالت ایسی کہ خطرہ تک مول نہیں لے سکتے۔ وہ بھی ادھار ہی لیتے ہوں گے۔ وہ پیدائشی سیاستدان ہیں۔ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے والد سے کسی نے پوچھا "بیٹا ہوا ہے یا بیٹی؟" تو ان کے والد نے کہا "ہمارے ہاں "دھاندلی" ہوئی ہے۔" اب اسلم خسرہ صاحب نے خود اپنی پریس کانفرنس میں اس دھاندلی کا انکشاف کیا ہے کہ حکومت کہتی ہے پاکستان میں 52 فیصد عورتیں اور 48 فیصد مرد ہیں تو پھر ہم کہاں گئے؟ مردم شماری میں ہمارے ساتھ دھاندلی نہ کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ

اس دھاندلی پر وائٹ پیپر شائع کریں جس میں کئی "بڑوں" کو اپنے کھاتے میں ڈال لیں۔

شیخ رشید صاحب سے ناراض ہیں کہ یہ اتنی دیر وزیر اطلاعات رہے' پر انہوں نے ہمیں کبھی کوئی اطلاع نہ دی' نہ ہمارے لیے کچھ کیا؟ ہو سکتا ہے ان کا اشارہ شیخ صاحب کی شادی کی طرف ہو کیونکہ یہی موقع ہے جس پر اسلم صاحب کی برادری کا کچھ بن سکتا ہے۔ اس لحاظ سے تو خسرے کھر صاحب کے بڑے احسان مند ہوں گے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ کہیں وہ یہ مطالبہ نہ کر دیں کہ چونکہ ہم میں بیک وقت مردوں اور عورتوں والی صلاحیتیں ہیں' اس لیے ہمارے دو ووٹ ہونے چاہئیں' ایک زنانہ پولنگ سٹیشن پر اور ایک مردانہ پر۔

اگرچہ ابھی تک حکومت نے انہیں لفٹ نہیں کرائی' تاہم انہیں ناامید ہونے کی بجائے امید سے ہونا چاہیے۔ ہو سکتا ہے وہ ہمیں ڈاکٹر سمجھ کر اس سے کچھ اور سمجھ لیں اور پوچھیں کہ ہم امید سے کیسے ہو سکتے ہیں؟ ویسے امید تو وہ سہارا ہے کہ ہمارے ایک مولانا صاحب کی شادی 95 سال کی عمر میں ہوئی لیکن وہ اللہ کی رحمت سے اس قدر پرامید تھے کہ شادی ہوتے ہی سکول کے قریب کرائے کے لیے مکان ڈھونڈنے لگے۔

ہو سکتا ہے وہ کہیں چونکہ لوگوں نے زنانہ اور مردانہ سیاست دیکھ لی ہے' اب درمیانہ سیاست دیکھیں یعنی ہمیں دیکھیں کیونکہ ہم دل لگا کر سیاست کرتے ہیں۔ ویسے یہ دل لگا کر سیاست کرنا بڑا مشکل ہے کہ پہلے بندہ دل لگائے اور پھر سیاست میں آئے۔

بہرحال وہ بڑے دل لگا کر خسرہ کنونشن کے لیے منشور بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ مطالبہ کریں کہ محکمہ ثقافت ہمیں دے دیا جائے۔ اگرچہ یہ محکمہ تو انہی کے پاس ہے اور پھر مائیکل جیکسن کے آنے سے ان کی نمائندگی تو ہو گی لیکن ہمیں ڈر ہے کہ وہ حکومت کو یہ دھمکی نہ دیدیں کہ اگر حکومت نے ہماری برادری کے مطالبات اپنی لسٹ میں شامل نہ کیے تو ہم حکومت کو اپنی برادری کی لسٹ میں شامل کر لیں گے۔

• جنرل رانیاں

یہاں جنرل رانیوں سے مراد وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اگرچہ بچپن میں ہم نے اتنی راجہ رانی کی کہانیاں نہیں سنیں' جتنی جنرل رانی کی۔ ہمارے تو ایک ایسے جنرل بھی گزرے ہیں جنہیں کشتی رانی دیکھنے کے لیے بلایا گیا تو خوشی خوشی تیار ہو کر پہنچے اور کافی دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد بولے "وہ جس رانی کا آپ ذکر کر رہے تھے' وہ کہاں ہے؟" لیکن ہماری یہاں مراد جنوبی کوریا کے جنرلوں کی بیویاں ہیں۔ صاحب! وہاں کی حکومت کو اپنے جنرلوں سے ان کی غیر ذمہ داری اور فضول خرچیوں کے متعلق جتنی بھی شکایتیں تھیں' وہ ان کی بیویوں کو باقاعدہ بلا کر ان سے "لگائی" گئیں اور کہا گیا کہ آپ اپنے خاوندوں کو کفایت شعاری کا سبق دیں۔ لگتا ہے حکومت کو پتہ چل گیا ہے کہ بیویاں ہی جنرلوں کو سبق سکھا سکتی ہیں۔

صاحب! اب ہمیں سمجھ آئی کہ بڑے بوڑھے جونہی لڑکا آوارہ اور غیر ذمہ دار ہونے لگے' اس کی شادی کرنے کا کیوں سوچنے لگتے ہیں۔ مشہور دانشور والٹیر نے کہا ہے کہ میرا بس چلے تو تمام مجرموں کی شادی کرا دوں۔ اس نے تو اعداد و شمار سے ثابت کیا کہ جتنے لوگ شادی شدہ ہوں گے' اتنی جرائم میں کمی ہو گی۔ آپ جرائم کے گوشواروں کے حیرت انگیز خانوں پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ ایک باپ کے مقابلے میں سو مجرد نوجوانوں کو سزائے موت ملی۔ اگرچہ یہ سیدھی سیدھی تھانے بند کر کے میرج سینٹرز کھولنے والی بات ہے۔ تاہم انھوں نے یہ بات زور دے کر کہی ہے کہ فوجیوں کی شادیاں کرا دو' پھر وہ فوج سے فرار نہیں ہوں گے۔ یوں انھوں نے کورٹ میرج کو کورٹ مارشل پر ترجیح دی۔ شادی اور فوج کا رشتہ 1980ء میں امریکی اداکار جیمز گارڈنر نے یوں جوڑا کہ فوج بھی شادی کی طرح ہوتی ہے کہ ہر بندہ اس سے شاکی ہوتا ہے لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہر کوئی اس کی لسٹ میں اپنا نام درج کرانے کے لیے لائن

میں بھی لگا ہوتا ہے۔ ویسے فوجیوں سے ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ ایک بار ابراہیم لنکن اپنے فوجی جنرل سے بحث کر رہے تھے' اس کی ہر بات کو دلیل سے رد کرتے جاتے لیکن جنرل نے قائل ہونے کی بجائے برہم ہو کر کہا "کیا آپ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں؟" لنکن نے مسکرا کر کہا "میں تو آپ کو بیوقوف نہیں سمجھتا لیکن ہو سکتا ہے' میں غلطی پر ہوں۔" لیکن صاحب کوریا حکومت نے یہ بحث خود کرنے کی بجائے تھرو پراپر چینل کی۔ البتہ ایک بات کی سمجھ نہیں آئی کہ فوجیوں کی بیویوں سے ان کے خاوندوں کی فضول خرچیوں کی شکایت کیوں کی گئی کیونکہ مرد تو پیسے کمانے کے لیے چھ دن کام کرتے ہیں اور ایک دن چھٹی جبکہ بیویاں پورے سات دن کام کرتی ہیں' ایک دن بھی پیسے خرچنے سے چھٹی نہیں کرتیں۔ ایک ایسی ہی بیوی خاوند کے لیے رومال کا کپڑا لائی تو خاوند نے پوچھا "میرے ایک رومال کے لیے اتنا کپڑا؟" تو وہ بولی "اگر آپ کے رومال سے بچ جائے تو میں سوٹ بنوا لوں گی۔" کامیاب خاوند کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ جو اس سے زیادہ کمائے' جتنے اس کی بیوی خرچ کرتی ہے اور کامیاب بیوی وہ ہوتی ہے جو ایسا خاوند ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائے۔ بہرحال کوریا حکومت نے جو کچھ کیا' سوچ سمجھ کر ہی کیا ہو گا۔ سنا ہے کہ حکومت کی اس بریفنگ کے بعد ایک بیوی نے گھر جاتے ہی خاوند جنرل کو ڈانٹنا شروع کر دیا کہ آپ اپنی فضول خرچیاں دیکھیں' ہمیشہ وہ چیزیں خرید کر لاتے ہیں جن کا گھر میں کوئی استعمال ہی نہیں ہوتا۔ خاوند نے پوچھا "مثلاً؟" بولیں "دیکھیں! آپ چار سال پہلے یہ آگ بجھانے والا آلہ خرید کر لائے تھے' آج تک یہ استعمال نہیں ہوا۔"

ہمارے ہاں روایت ہے کہ ہم شکایت لے کر اس کے پاس جاتے ہیں جو ہمیں زیادہ بااختیار اور منصف مزاج لگتا ہے۔ ویسے بھی بیوی تو گھر کی حکمران ہے' ساس وزیر جنگ' سالیاں وزیر داخلہ' سالے وزیر خارجہ اور صدر یہاں بھی سسر صاحب ہی ہوتے ہیں جبکہ خاوند عوام ہوتا ہے۔ اسے عوام شاید اس لیے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں عوام اپنے حکمران بدلتے رہتے ہیں جبکہ حکمرانوں نے آج تک عوام کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ بہرحال

جو شخص اپنی بیوی سے نہیں ڈرتا' وہ بڑا بزدل ہوتا ہے۔

صاحب! ہمیں آج پتہ چلا ہے کہ کوریا نے اتنی ترقی اس طرح کی کہ وہاں جب کوئی غلط کام کرتا ہے' اس کی شکایت اس کی بیوی کی عدالت میں کر دی جاتی ہے۔ فرانسیسی رائٹر میکولم ڈی چیزل کہتا ہے "بیوی وہ عدالت ہے جو دن رات کھلی رہتی ہے۔ یوں اس کورٹ میں ہر وقت اپیل ہو سکتی ہے۔" ویسے شادی کے آٹھ دس سال بعد یہ کورٹ اچھی خاصی سپریم کورٹ بن جاتی ہے کہ اس میں خاوند آگ کی طرح ہوتا ہے۔ اگر اس پر بروقت قابو نہ پایا جائے تو یہ آگ پھیل جاتی ہے۔ یوں محترمہ نے اکیلے پوری ہنری کی آگ پر قابو رکھا۔ اسی لیے باب ہوپ کو کہنا پڑا کہ جس طرح ٹی وی والوں کا ایک ڈرامہ ہٹ ہو جائے تو وہ اس کی سیریز بنا ڈالتے ہیں' ایسے ہی زسا ز ساگابورے نے ایک شادی کی کامیابی کے بعد اس کی سیریز شروع کر دی۔ ویسے بلاشبہ شادی شدہ مرد زیادہ قانون کا احترام کرتے ہیں جس کی عادت انہیں گھر سے پڑتی ہے کیونکہ وہ جب مدر ان لاء یعنی قانونی ماں کا احترام کرتے ہیں تو سمجھتے ہیں قانون کا ہی احترام کر رہے ہیں۔ کچھ افریقی ممالک میں تو فوج میں بھرتی کے وقت شادی شدہ کو ترجیح دی جاتی ہے کہ شادی شدوں کو پہلے ہی لڑنے کا تجربہ ہوتا ہے۔

بیویاں انسان کا کامیاب بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ شاید عرب شیخ اپنی بیویوں ہی کی وجہ سے مالا مال ہیں بلکہ وہ بیویوں سے بھی مالا مال ہیں۔ پچھلے دنوں ابوظہبی کے ایک ہوٹل میں سو عرب شیخوں کو ان کی بیویوں سمیت دعوت دی جانا تھی تو ہوٹل کے مالک نے معذرت کر لی کہ ہمارے ہال میں صرف چار سو سیٹیں ہیں۔

صاحب! اب ہمیں اس بات کی سمجھ بھی آ گئی ہے کہ میاں نواز شریف صاحب پاکستان کو بار بار کوریا بنانے کی بات کیوں کرتے ہیں۔ ویسے بھی وہ میاں ہیں اور ایک میاں سے زیادہ بیوی کی افادیت کون جان سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے کوریا کی طرح اب یہاں بھی بدعنوانی کرنے والوں کی شکایتیں ان کی بیویوں سے کی جایا کریں۔ ممکن ہے بیویوں کو آنریری مجسٹریٹ بنا دیا جائے۔ ویسے اگر ماں ملک کو اچھا مستقبل دے سکتی ہے تو بیوی

ملک کو اچھا حال کیوں نہیں دے سکتی۔ اب تو لگتا ہے نوابزادہ نصراللہ صاحب کا آئندہ اتحاد بیویوں کا ہی ہو گا۔ یوں انہیں کسی کی شکایت کے لیے صدر صاحب کے پاس بھی نہ جانا پڑے گا لیکن انہیں چاہیے کہ کسی بیوی کے سامنے انتقال اقتدار کی بات نہ کریں۔ کہیں وہ کسی اقتدار صاحب کے انتقال کی خبر سمجھ کر رونے نہ لگیں۔ بہرحال اس طرح جرائم میں کمی آ سکتی ہے لیکن یہ نہ ہو' جیسے سلطانہ ڈاکو شادی کے بعد کسی کو ملا اور کہنے لگا کہ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔ دوسرے نے خوش ہو کر کہا "کیا آپ نے جرائم سے توبہ کر لی؟" کہا "نہیں' شادی سے توبہ کر لی۔"

○○○

- **اشتہاری صدر**

جارج بش کو دنیا کا پہلا اشتہاری صدر قرار دے دیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس پر بنگلہ دیش کے صدر ارشاد کہیں کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' پہلے میں اشتہاری ہوا تھا۔

شاید اسی لیے امریکہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ صدر بش نے یہ مقام 7.5 ملین بجٹ کی اشتہاری فلم میں کام کر کے حاصل کیا ہے۔ یہ فلم ٹریول انڈسٹری کی کمپنیوں کو وزارت تجارت کی طرف سے سرمایہ کاری کی دعوت دینے کے لیے بنائی گئی ہے جس میں صدر بش نے یہ ڈائیلاگ بولے ہیں:

"اب آپ کس بات کا انتظار کر رہے ہیں' کیا آپ کو صدر کی طرف سے دعوت نامے کا انتظار ہے۔"

صاحب! ڈائیلاگ سے تو لگتا ہے کہ یہ سب نوابزادہ نصراللہ خان صاحب کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے لیکن صدر بش نے یہ ڈائیلاگ اس طرح ڈیلیور کیا ہے کہ لگتا ہے اس ڈیلیوری کے وقت کئی خواتین ڈاکٹر وہاں موجود تھیں۔

صدر بش شروع سے ہی بہت تیز رہے ہیں۔ ہم تو دوران تعلیم چھ گھنٹے پڑھتے اور چھ گھنٹے سوتے لیکن وہ یہ دونوں کام ایک ہی وقت میں کر لیتے۔ بچپن ہی سے اداکاری کا شوق تھا' سو سیاست میں آ گئے۔ ہمارے ہاں تو اداکاری کا یہ مقام ہے کہ ایک مشہور اداکار نے ایک بزنس مین کی بیٹی سے شادی کرنے کی بات کی تو بزنس مین نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں اداکار سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کر سکتا۔ اداکار نے کہا کہ میں کوئی معمولی اداکار نہیں' آپ آ کر میرا ڈرامہ تو دیکھیں۔ ڈرامہ دیکھ کر بزنس مین نے اسے اپنی بیٹی سے شادی کرنے کی اجازت دیدی۔ اداکار نے پوچھا "کیا آپ نے یہ فیصلہ اس لیے کیا کہ میں بہت بڑا اداکار ہوں؟" بزنس مین نے کہا "نہیں' اس لیے کہ ڈرامہ دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ تم اداکاری کی ابجد سے بھی واقف

نہیں۔" لیکن صاحب صدر ریگن کے بعد تو امریکہ کے صدر کے لیے بہت اچھا اداکار ہونا ضروری سا ہو گیا ہے۔ اب تو لگتا ہے آئندہ امریکہ کے متوقع صدر کا باقاعدہ اداکاری کا آڈیشن ہو گا۔ یوں اسے سپریم کونسل کے بجائے فلم کونسل سے منظوری لینا ہو گی۔

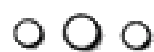
صاحب! اگرچہ آمریکہ لکھنے کے لیے پہلے "آمر" لکھنا پڑتا ہے' پھر ساتھ "یکہ" لگا کر آمریکہ بناتے ہیں لیکن وہاں فرد کی رائے کا اس قدر احترام ہے کہ جب امریکی صدر کیلون کے مرنے کی اطلاع ڈورتھی پارکر کو ملی تو اس نے کہا' پہلے صدر کیلون سے اس کی تصدیق تو کرا لی جائے۔ سو ہو سکتا ہے یہ اشتہاری فلم' دراصل امریکیوں کی شخصی آزادی کا اشتہار ہی ہو کہ "ہمارا صدر ماڈلنگ تک کر سکتا ہے۔" امریکی صدر ہینری ایس ٹرومین نے کہا تھا کہ دنیا کی سب سے بہترین جیل وائٹ ہاؤس ہے اور جیسے مختلف جیلوں میں قیدیوں کو ہنر سکھائے جاتے ہیں' ہو سکتا ہے صدر بش کی یہ ماڈلنگ اس سلسلے کی کڑی ہو کہ کل وہ صدر نہ رہیں تو ان کے ہاتھ میں کوئی ہنر ہو جس سے ان کا گزر بسر ہو سکے۔

صدر بش امریکہ کے علاوہ کئی اور ممالک کے بھی صدر ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ روس کے بھی صدر لگتے ہیں۔ کسی نے پیش گوئی کی تھی 2000ء میں روس کے ہر دوسرے شخص کے پاس اپنا ذاتی ہوائی جہاز ہو گا تو کسی نے پوچھا "لیکن وہ اس کا کرے گا کیا؟" منصوبہ بندی کرنے والے نے بتایا "فرض کیا آپ کا ہمسایہ بتاتا ہے کہ لینن گراڈ میں آلو بک رہے ہیں تو آپ کو اس سے پہلے وہاں پہنچنے کے لیے ہوائی جہاز تو چاہیے ہو گا۔"

صدر بش کے نیو ورلڈ آرڈر کے بعد ہم سمجھ رہے تھے کہ 2000ء تک امریکہ تیسری دنیا کے ممالک کو امداد میں صدر دیا کرے گا۔ ہمیں یہ علم نہ تھا کہ نیو ورلڈ آرڈر کے تحت صدروں کو اشتہاروں میں بھی کام کرنا پڑے گا۔ بہرحال صدر بش کی اشتہار میں پرفارمنس دیکھ کر ہالی وڈ کی ایک اداکارہ نے کہا "میرا دل آج شام پھر صدر بش کے ساتھ گزارنے کو مچل رہا ہے۔" کسی نے پوچھا "آپ پہلے ان کے ساتھ شام گزار

چکی ہیں؟" تو اس نے کہا "نہیں' پہلے بھی ایک بار میرا دل مچلا تھا۔" پچھلے دنوں جب وہ ماسکو گئے تو وہاں انہوں نے تاجروں کے ایک اجتماع میں لطیفہ سنایا۔ اگرچہ زیادہ تاجروں نے کہا "ہم نے لطیفہ سنا نہیں' دیکھا ہے۔" بہرحال لطیفہ یہ تھا کہ ایک نوجوان کسی کمپنی کا مینیجر بنا تو اس کے پیش رو نے اسے تین لفافے دیئے اور نصیحت کی کہ جب اسے مشکلات کا سامنا ہو تو ایک لفافہ کھول کر درج ذیل ہدایات پر عمل کرے۔ ایک روز مینیجر کو محسوس ہوا کہ حالات اچھے نہیں جا رہے ہیں۔ اس نے لفافہ کھولا جس میں لکھا تھا۔ "اپنے پیش رو کو الزام دو۔" اس نے ایسا ہی کیا اور کچھ عرصہ کے لیے حالات ٹھیک ہو گئے۔ جب حالات دوبارہ بگڑے تو اس نے لفافہ نمبر 2 کھولنے کا فیصلہ کیا جس میں لکھا تھا "اپنے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ کو الزام دو۔" اس نے ایسا ہی کیا لیکن آمدنی مسلسل گرتی رہی۔ آخر کار اس نے پس و پیش کے بعد تیسرا لفافہ کھولا جس پر لکھا تھا "تین لفافے تیار کر لو۔"

ہو سکتا ہے صدر بش نے اشتہار میں کام کر کے صدروں کو کوئی ایسا ہی لفافہ دیا ہو۔ ویسے بھی یہ اشتہارات کا دور ہے۔ امیلڈا مارکوس تو پہلے ہی جوتوں کا اشتہار بن چکی ہے۔ ہو سکتا ہے کل جان میجر اس اشتہار کے ساتھ سکرین پر نظر آئیں کہ "بغیر سوچے سمجھے لمبا ہونے کا مجرب نسخہ۔" گوربا چوف ترقی یافتہ ملکوں کی سکرین پر آ کر کہیں "جو دے اس کا بھلا' جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔" نیلسن منڈیلا ٹمیار سنو کے اشتہار میں کہہ رہے ہوں "کالے رنگ نوں گورا کر دی تو گویاں نو بش ورگا!"



• I,S

ڈاکٹر اختر رشید صاحب نے انکشاف کیا ہے کہ مجیب الرحمان شامی صاحب لکھتے وقت بائیں آنکھ بند کر لیتے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ان کی کتنے برسوں کی تحقیق کا نتیجہ ہے اور وہ کب سے شامی صاحب پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ تاہم اتنا پتہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب شامی صاحب کا اس قدر احترام کرتے ہیں کہ وہ تو کینٹین میں شامی کباب بھی کھڑے ہو کر بڑے احترام سے ریسیو کرتے ہیں۔ پھر بھی اگر وہ یہ بات کسی اور لکھنے والے کے بارے میں کہتے تو ہم دونوں آنکھیں بند کر کے مان لیتے بلکہ یہ تک مان لیتے کہ ایک آنکھ بند کر کے لکھنے کا مطلب بھی وہی ہو گا جو مخلوط محفلوں میں ایک آنکھ بند کر کے دیکھنے کا ہوتا ہے لیکن ہمیں پتہ ہے شامی صاحب کسی ایسے ویسے مقصد کے لیے نہیں لکھتے بلکہ وہ رضائے الہٰی اور سعید الہٰی کے لیے لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر اختر رشید صاحب چونکہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں' سو ہمارا پہلا قیاس تو یہی ہے کہ مجیب الرحمان شامی صاحب نے انہیں آنکھیں دکھائی ہوں گی جس سے ڈاکٹر صاحب نے ان کی بائیں آنکھ بند کر لینے کے مرض کی نشاندہی کی ہے۔

صاحب جیسے بچے کے دو منہ ہوتے ہیں' دوسرا منہ اس کی جیب ہوتی ہے۔ ایسے ہی لکھنے والوں کی تین آنکھیں ہوتی ہیں' تیسری آنکھ ان کی جیب ہوتی ہے۔ یوں ان میں سے دو آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں' شاید اسی لیے ہمارے لکھنے والوں کی ایک عینک چہرے پر اور دوسرے جیب میں ہوتی ہے۔ اکثر کی نظر ان کی نیت کی طرح ہوتی ہے۔ بعض کو تو اپنی عینک دیکھنے کے لیے بھی کنٹیکٹ لینز لگانے پڑتے ہیں۔ ایک کالم نگار کی عینک گم ہو گئی تو کسی نے کہا "آپ عینک ڈھونڈ کیوں نہیں رہے؟" تو وہ کہنے لگے "عینک لگائے بغیر میں کوئی چیز نہیں ڈھونڈ سکتا۔" کچھ کی نظر ایسی ہوتی ہے کہ ایک شاعر سے کسی نے کہا "وہ جو بوڑھا کھڑا ہے' بڑا مصیبت کا مارا لگتا ہے۔" تو شاعر

نے کہا "کونسا بوڑھا بھئی! مجھے عینک کے بغیر اتنی دور نظر نہیں آتا۔" دوسرے نے کہا "وہ جو لڑکی کے ساتھ کھڑا ہے۔" کہا "کونسی لڑکی؟" وہ جس کے کان میں آدھ کھلی کلی' گلے میں لاکٹ اور بائیں رخسار پر تل ہے۔" ہمارے ایک دوست ادیب نے نظر کمزور ہونے کے نقصانات بتاتے ہوئے کہا "سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ مجھے کام زیادہ کرنا پڑتا ہے۔" پوچھا "کیسے؟" بولے "مجھے یہ پتہ نہیں چلتا کہ باس مجھے دیکھ رہا ہے یا نہیں' اس لیے مجھے تمام وقت کام ہی کرتے رہنا پڑتا ہے۔" ناصر کاظمی صاحب سے کسی نے پوچھا "آپ ساری رات جاگتے کیوں ہیں؟" تو انہوں نے کہا "آپ کی آنکھ میں کنکر ہو تو آپ سو نہیں سکتے جس کی آنکھ میں پورا محبوب ہو' وہ کیسے سوئے؟"

انگریزی میں آنکھ کو "آئی" کہتے ہیں۔ سیاستدانوں اور ادیبوں کو "آئی" سے اچھا کوئی اور لفظ نہیں لگتا' وہ ہر فقرے کو انگریزی کے اس "آئی" سے شروع کرتے ہیں جو اردو میں انا کہلاتا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں بھی I,S ہی ہیں۔

عینک آنکھ کا لباس ہے۔ شاید اسی لیے لوگ معنک لڑکیوں کو پسند نہیں کرتے ہمارے دوست کو آنکھوں کے سامنے دور ایک دھبہ نظر آتا۔ ہم نے کہا "عینک لگوا کر دیکھنا تھا۔" کہا "عینک لگوا کر دیکھا تو دھبہ پاس نظر آنے لگا۔" کہتے ہیں ہمارے ایک سابق حکمران اس لیے عینک لگاتے تھے کہ ان کی آنکھیں کسی اداکارہ سے ملتی تھیں۔ حالانکہ بھیدی کہتے ہیں کہ ان کی آنکھیں تو آپس میں نہیں ملتی تھیں' کسی اداکارہ سے کیا ملتیں ہوں گی۔ البتہ آج کل کے سیاستدانوں کی آنکھیں اداکاراؤں سے اکثر ملتی رہتی ہیں۔ نظر خراب ہونے میں یہ خرابی بھی ہے کہ بندہ جس پر نظر ڈالتا ہے' خراب نظر ہی ڈالتا ہے۔ بیگم عابدہ حسین صاحبہ جو الف ب بھی انگریزی میں پڑھتی ہیں' ان سے ایک تقریب میں کسی نے پوچھا "آپ کے پاس چشمہ ہو گا؟" تو وہ بولیں "میری زمینوں میں تو نہیں ہے۔" جہاں تک شاہی صاحب کا معاملہ ہے' وہ عینک تو لگاتے ہیں مگر ان کی نظر اتنی تیز ہے کہ اندھیرے میں لاکھوں میل دور دیکھ سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ

کہیں میں جھوٹ لکھ رہا ہوں۔ اندھیرے میں اتنی دور کون دیکھ سکتا ہے لیکن یقین کریں یہ سچ ہے! وہ رات کو چاند دیکھ لیتے ہیں اور آپ کو پتہ ہے چاند یہاں سے کتنی دور ہے! ممکن ہے ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر کہ وہ لکھتے وقت ایک آنکھ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں' ان کی غیر جانبداری کی جانب اشارہ کیا ہو کہ وہ سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ بہرحال شاہی صاحب کی تحریریں پڑھ کر دونوں آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ سو ممکن ہے شاہی صاحب جو لکھنے بیٹھتے ہوں' عین اس وقت ان کی بائیں آنکھ میں کچھ پڑ جاتا ہو جس کی وجہ سے وہ بند ہو جاتی ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف بائیں ہی کیوں؟ صاحب ہمیں اس دائیں بائیں کے چکر کی کبھی سمجھ نہیں آئی۔ امریکی جزیرے "ہوائی" میں شادی شدہ اور شریف لڑکیاں بالوں میں دائیں طرف پھول لگاتی ہیں جبکہ "دوسری" دوسری طرف۔ ہمارے ایک ادیب نے بتایا کہ "ہوائی" جزیرے پر دائیں بائیں کے چکر کی وجہ سے میں مصیبت میں پھنس گیا۔ میں نے شادی شدہ کو کنواری سمجھ کر شادی کی دعوت دے دی۔ ہم نے پوچھا "کیا اس نے برا منایا؟ کہا "نہیں' وہ شادی کے لیے تیار ہو گئی۔" کہتے ہیں آخری عمر میں لینن کے دائیں ہاتھ پر فالج گرا تو وہ بائیں ہاتھ سے لکھنے لگے۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب کا اشارہ اسی بائیں طرف ہو۔ گویا شاہی صاحب دائیں آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ دائیں کو انگریزی میں رائٹ کہتے ہیں' سو شاہی صاحب رائٹسٹ ہیں۔ ہمیں یہ تو نہیں پتہ رائٹ میں کتنی طاقت ہوئی ہے' یہ پتہ ہے کہ دو رائٹ مل جائیں تو وہ ہوائی جہاز ایجاد کر لیتے ہیں۔

○○○

- سلیم غیر شاہی جوتے

لوگ قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ایک خاتون کو سو کا کھلا چاہیے تھا۔ اس نے راہ گیر سے مانگا تو اس نے کھلا دے دیا تو اس خاتون نے ساتھ والی سے کہا "یہ شخص ضرور شادی شدہ ہے۔" دوسری نے پوچھا "تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" بولی "اس نے پہلے ادھر ادھر دیکھا' پھر بٹوہ نکالا اور اسے کھولنے سے پہلے میری طرف کمر کی۔" ہمارے ایک ماہر نفسیات دوست بھی ہر "قیامت" پر نظر رکھتے ہیں۔ اہل تصویر میں سے اہلیہ بتا دیتے ہیں۔ ہم نے انہیں ایک میاں بیوی کی تصویر دکھائی تو کہنے لگے "یہ ضرور ان کی شادی سے پہلے کی تصویر ہے۔" وجہ پوچھی تو کہا "کسی بیوی کا ہاتھ خاوند کی جیب سے اتنے فاصلے پر نہیں ہوتا۔" البتہ ایک بار ہم نے انہیں بھی مشکل میں دیکھا۔ ایک پرچے میں بیگم عابدہ حسین اور فخر امام کی تصویر چھپی تو سوچ میں پڑ گئے۔ پوچھا "کیا سوچ رہے ہیں؟" کہا "یہ پتہ نہیں چل رہا' ان میں بیوی کون سی ہے؟" لیکن پچھلے دنوں انہوں نے وزیر اطلاعات اور وزیر ٹرانسپورٹ ملک سلیم اقبال صاحب کی مقامی اخبار میں جوتے پالش کرتے ہوئے چھپی تصویر دیکھ کر کہہ دیا کہ یہ کسی بہت اچھے سیاستدان کی ہے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ وہ ملک صاحب کو بالکل نہیں جانتے۔

ملک صاحب کی طبیعت شروع سے وزیرانہ ہے۔ شادی ہوئے کئی برس ہو گئے ہیں مگر ابھی تک وہ اپنی بارات لے جانے کی پلاننگ کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی پہلی شادی کی بارات میں چیف منسٹر کو ضرور بلاؤں گا۔ ملک صاحب دھن کے پکے اور کام تمام کر کے چھوڑنے والے ہیں۔ ایسے ہی ایک سیاستدان جلدی جلدی اپنے کھیتوں کو پانی لگوا رہے تھے۔ کسی نے پوچھا "جلدی کاہے کی ہے؟" کہا "دیکھ نہیں رہے بادل امڈے آ رہے ہیں! بارش شروع ہونے سے پہلے میں یہ کام ختم کرنا چاہتا ہوں۔" ملک

سلیم اقبال صاحب جب سکول میں پڑھتے تھے تو ساتھی لڑکے ان سے ڈرتے رہتے کیونکہ بات بات پر جوتے اتار لیا کرتے۔ میونسپل کمیٹی کے ممبر بنے تو سارا دن سائیکل پر تحصیل کے اتنے چکر لگاتے کہ تحصیلدار کو چکر آنے لگے۔ محلے والے ہار پہنا کر سائیکل سے اتارتے۔ سائیکل ایسی تھی کہ ایک بار ایک بوڑھا بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ملک صاحب نے کہا "آپ توں یوں دیکھ رہے ہیں جیسے زندگی میں پہلی بار سائیکل دیکھی ہے۔" تو بوڑھے نے کہا "سچ کہتے ہو' زندگی میں پہلی بار میں نے یہی سائیکل دیکھی ہے۔" جس کا ہر پرزہ آواز دیتا ہے سوائے گھنٹی کے۔ اب تو ماشاء اللہ اتنے امیر ہو گئے ہیں کہ سائیکل کے لیے علیحدہ ڈرائیور رکھا ہوا ہے۔ اسی "سائیکل" کی وجہ سے الیکشن جیتے اور وزیر ٹرانسپورٹ بھی ہیں۔ یوں کسی دوست سے حال پوچھیں اور وہ کہہ دے "بس ٹھیک ہے۔" تو سوچنے لگتے ہیں' یہ کونسی بس کی بات کر رہا ہے؟ صحت ایسی کہ میرٹ پر وزیر صحت رہے' آ رہے ہوتے ہیں تو لگتا ہے محکمہ صحت آ رہا ہے مگر بڑے دل کے مالک ہیں اور ڈاکٹروں نے دل بڑا ہونا بیماری کہہ کر انہیں ہسپتال میں داخل کر لیا۔ ایسی ہی صحت والے ہمارے ایک قوال کہہ رہے تھے "مجھے اپنے سائے سے بڑا ڈر لگتا ہے۔" پوچھا کیوں؟ کہا "جب میں سایہ دیکھتا ہوں' لگتا ہے پورا محلہ پیچھے آ رہا ہے۔" ملک سلیم اقبال صاحب کہتے ہیں "ایک وقت میں مجھے ایک کھانا پسند ہے۔" ہمارے سابق صدر خواجہ ناظم الدین کو بھی ایک ہی کھانا پسند تھا' اس لیے وہ جب ایک کھانا کہتے تو مراد ہوتا ایک دیگ چاول اور ایک بکرا۔ ایک تقریب میں انہوں نے کہا "میں صرف ایک لقمہ چکھوں گا۔" تو بھیدی منتظم نے دو نان اور ایک چرغہ پیش کر دیا۔ ملک صاحب کہتے ہیں "حسن میری کمزوری ہے۔" حالانکہ ان کی صحت دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا' انہیں بھی کوئی کمزوری لاحق ہو سکتی ہے۔ ویسے وہ وزیر ٹرانسپورٹ کے ساتھ ساتھ وزیر اطلاعات بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے انہیں ٹرانسپورٹ اس لیے دی گئی تاکہ وہ اطلاعات جلدی پہنچایا کریں۔ ہمارے ایک وزیر اطلاعات ایسے بھی گزرے ہیں

جو حلف برداری کی تقریب میں یہ پوچھتے پھر رہے تھے کہ مجھے یہ اطلاعات پہنچانی کسے ہے؟

ملک سلیم اقبال صاحب کی صرف جوتے پالش کرنے والی تصویر دیکھ کر ایک ماہر نفسیات کا ان کو بہت اچھا سیاستدان قرار دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ سوچا چونکہ تصویر میں ملک صاحب نے جوتا اتارا ہوا ہے اور آج کل سیاستدان یہی کچھ کر رہے ہیں۔ کچھ سیاستدانوں کو دیکھ کر تو لوگ بھی جوتے اتار لیتے ہیں۔ ہمارے ایک گلوکار نے کہا "یہ کوئی بڑی بات نہیں' جب میں رات کو گاتا ہوں تو عظیم مغنی انریکو کاروسو کی طرح میرا گانا سن کر بھی اہل محلہ میرے گھر کی طرف آنے لگتے ہیں اور کسی کے پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے بلکہ ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔" ویسے ہو سکتا ہے ملک صاحب محمد خان جونیجو صاحب کی طرح جوتے اتارنے کی پریکٹس کر رہے ہوں کیونکہ اگر جونیجو صاحب جوتے پہن کر پیر پگاڑا صاحب کو ملنے جایا کرتے تو وزیراعظم نہ بن سکتے۔ یا ممکن ہے ملک صاحب خود اپنے جوتے چمکا کر نواز شریف صاحب کی خود انحصاری کی پالیسی کی ماڈلنگ کر رہے ہوں۔ بہرحال جو بھی ہو' یہ واضح ہے کہ شہزادہ سلیم کے بعد یہ دوسرے سلیم ہیں جنہوں نے جوتوں سے "فیم" حاصل کی۔ پہلے ملک صاحب فوجیوں کو جوتے سپلائی کرتے اور ان سلیم غیر شاہی جوتوں سے 25 ہزار ماہانہ کمایا کرتے لیکن ہمارے ماہر نفسیات دوست نے بتایا کہ میں نے تصویر دیکھ کر ان کو سیاستدان اس لیے کہا کہ وہ نظر تو جوتے پالش کرتے آ رہے ہیں مگر دراصل وہ نہیں کر رہے کیونکہ تصویر میں ان کے ہاتھ میں جوتے پالش کرنے والا نہیں' کپڑے صاف کرنے والا برش ہے۔ ہمیں تو یہ کسی سیاستدان کی "تحلیل نفسی" نہیں سیاست کی "تفصیل نفسی" لگتی ہے۔

○○○

• کمر۔ شل تھیٹر

سٹیج کی "بڑھی" ہدایت کارہ ناہید خانم صاحبہ نے آخر کہہ ہی دیا "ہم 25 سال سے سٹیج کی خدمت کر رہے ہیں لیکن الحمراء میں ہمیں بیٹھنے کے لیے کمرہ میسر نہیں' سیڑھیاں ہی ہیں جبکہ ایک طبقے کو ساری مراعات حاصل ہیں۔" اگرچہ انہوں نے ساری اس طرح کہا جیسے ان کا مخاطب طبقہ "سوری" کہتا ہے۔ پھر بھی بات سمجھ میں آ گئی ہے البتہ یہ پتہ نہیں چلا یہاں "ہم" سے مراد کون کون ہیں؟ ویسے تو وہ صرف اپنی شخصیت کا احاطہ کرنے کے لیے بھی "ہم" کا لفظ استعمال کر سکتی ہیں کیونکہ وہ خود آ رہی ہوں تو لوگ یہی کہتے ہیں خواہ تین آ رہی ہیں۔ اکیلی دو آدمیوں سے بات کر رہی ہوں تو لگتا ہے اجتماع سے خطاب کر رہی ہیں بلکہ اکثر تو یہ لگتا ہے اجتماع دو آدمیوں سے خطاب کر رہا ہے۔ پان یوں کھاتیں ہیں جیسے ہم کھانا کھاتے ہیں۔ بندہ ان کے پاس بیٹھا ہو تو یہی لگتا ہے پان شاپ پر بیٹھا ہے۔ ایسی ہدایتکارہ کہ ان کی ہدایت رائٹر کے لیے اکثر کاری ہوتی ہے۔ ہم عمر انہیں اکثر "ری" کہہ کر بلاتی ہیں جیسے ری رائٹر! ری ڈائریکٹر!

صاحب! الحمراء سے ہمارے بھی جائزہ تعلقات ہیں لیکن گزشتہ دنوں اپنا لکھا ڈرامہ دیکھنے گئے۔ پہلے تو ڈرامے کی حالت دیکھ کر یہ لگا کہ غلطی سے تھیٹر آنے کی بجائے آپریشن تھیٹر میں آ گئے ہیں۔ ہمارا ڈرامہ کسی اور "حال" میں ہو گا لیکن ہال میں ڈرامہ دیکھنے والے ایوب خاور اور چند دوسرے دوست مسلسل ہمیں غصے سے گھور رہے تھے' جس سے ہمیں یقین ہوا کہ یہی ہمارا ڈرامہ ہو گا۔ ہمارے ایک دوست کے بقول تو کمر........ شل تھیٹر مضر صحت ہے۔ وہ ہمیشہ مدیحہ گوہر اور شعیب ہاشمی اور ہم نواؤں کے ڈرامے ہی دیکھنے جاتے ہیں۔ وجہ یہ بتاتے ہیں کہ ڈاکٹروں نے مجھے رش اور بھیڑ والی جگہوں پر جانے سے منع کر رکھا ہے۔ ایسے ہی ایک تھیٹر کے ڈائریکٹر نے برنارڈشا کو دعوت

دی کہ پہلے شو پر آ کر ہمارا ڈرامہ دیکھیں لیکن جلدی تشریف لائیں تاکہ سیٹ دستیاب ہو سکے تو برنارڈشا نے لکھ بھیجا' دوسرے شو پر آؤں گا اگر وہ ہوا تو.......

آغا صاحب کے حشر کے بعد اصلاحی ڈرامے آئے جنہیں اصلاحی ڈرامے بھی کہا جاتا کیونکہ ڈرامے کے آخر میں اسلحہ استعمال کیا جاتا تاکہ اس کی آواز سے حاضرین اٹھ جائیں کہ ڈرامہ ختم ہو گیا۔ چلتے پھرتے تھیٹر تھے جنہیں لوگ چلتے پھرتے دیکھتے۔ عالم لوہار کے مقابلے میں تھیٹر لگانے والے ایک شخص نے بتایا کہ مجھے قصبے قصبے جا کر تھیٹر لگانے میں کبھی ٹرانسپورٹ پرابلم نہ ہوئی کیونکہ میں جس قصبے میں ایک شو کر لیتا' وہاں کے اہالیان خود مجھے قصبے سے باہر تک چھوڑ آتے ہیں۔ پھر الحمراء تھکے ہارے لوگوں کے لیے ڈرامے کی آخری آرام گاہ قرار پایا۔ بڑے بڑے کمال ڈرامے ہوئے' خود ناہید خانم صاحبہ کے لیے ایک ڈرامے کا آدھ گھنٹے کا سین یوں لکھا ہوا تھا:

امان اللہ آتا ہے...... امان اللہ جاتا ہے...... آدھ گھنٹہ

اداکاراؤں کو شکایت ہے کہ رائٹرز کے پاس ہمارے لیے اچھے کریکٹر نہیں ہوتے۔ اب تو مدیحہ گوہر نے بھی کہہ دیا کہ الحمراء میں اداکاراؤں کے کریکٹر اچھے نہیں ہوتے۔ اکثر اتنا تنگ لباس پہنتی ہیں کہ دیکھنے والے تنگ ہوتے ہیں۔ ہمارے اداکار بڑے عجیب و غریب ہیں جبکہ ہالی وڈ کے اداکار بڑے عجیب و امیر ہیں۔ وہاں کی ایک اداکارہ نے بتایا کہ میں بمشکل سات ہزار ڈالر ہفتہ وار کماتی ہوں تاکہ غریب اداکاراؤں میں میرا شمار ہو سکے کیونکہ اس سے کم آمدنی والوں کو تو غریب اداکاراؤں میں شامل نہیں کرتے۔

لارڈ بائرن نے کہا تھا کہ مزاحیہ ڈرامے کا اختتام ٹریجڈی پر ہونا چاہیے لیکن جرمن ڈرامہ نگار بریخت نے شاید ہمارے تھیٹر کے لیے کہا ہے کہ جس تھیٹر میں ہنسی نہ آئے' اس تھیٹر پر ہنسنا چاہیے۔ ہمارے سب اداکار ہنسانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک اداکار نے کہا "یہ بات نہیں لوگ سنجیدہ اداکاری بھی پسند کرتے ہیں' میں نے مرنے کا سین کر کے سب کو رولا دیا۔" تو دوسرے نے کہا "وہ اس لیے روئے تھے کہ انہیں پتہ تھا تم صرف مرنے کی اداکاری کر رہے ہو۔"

اداکار شکیل لاہور کے تھیٹر میں سنجیدہ ادکاری کر رہا تھا کہ سیڑھیوں سے پھسل کر دوسری طرف جا گرا۔ لوگ بہت پریشان ہوئے کیونکہ شکیل نے دوبارہ سٹیج پر آ کر ڈائیلاگ بولنے شروع کر دیئے تھے۔ ہمارے دوست اداکار سمیع اللہ عرفی کہتے ہیں "سٹیج پر ہنسانا ضروری نہیں' کردار اہم ہونا چاہیے۔ جیسے فلاں ڈرامے میں' میں سب سے اہم رول کر رہا ہوں بلکہ میری وجہ سے ڈرامہ چل رہا ہے۔" پوچھا "کیسے؟" کہا "پردہ اٹھتا ہے' میں سٹیج پر ہوتا ہوں اور دروازہ کھولتا ہوں جس سے ہیرو' ہیروئن سٹیج پر آتے ہیں۔" ہم نے کہا "یہ تو کوئی اہم کردار نہ ہوا۔" تو بولے "اہم کیوں نہ ہو' اگر میں دروازہ نہ کھولوں تو ڈرامہ ایک دن بھی نہ چل سکے۔" انہوں نے فیصل آباد میں ایک ڈرامے میں بڑا ہلا دینے والا رول کیا۔ موصوف کا رول یہ تھا کہ وہ ناظرین کو ہلا ہلا کر جگاتے تھے۔

امریکی نقاد ویل کٹ گبز کہتا ہے "امریکی تھیٹر لوگوں کے لیے اسپرین ہے۔" اگرچہ ہمارے تھیٹروں میں بھی لوگوں کے لیے اسپرین مہیا ہونی چاہیے لیکن فی الحال ناہید خانم صاحبہ نے اداکاروں کی بھلائی کے لیے قدم اٹھایا ہے۔ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ انہیں یہ قدم بہت پہلے اٹھانا چاہیے تھا کیونکہ انہیں قدم اٹھانے میں اتنی دیر لگتی ہی ہے۔ الحمراء سے انہیں اتنا لگاؤ ہے کہ اسے ہمیشہ الھمرا ہی کہتی ہیں۔ ان کے سامنے دوسرے ڈائریکٹر بہت چھوٹے نظر آتے ہیں بلکہ اس کے سامنے تو بالکل نظر نہیں آتے۔ ایسی ہی ایک اداکارہ چمن چمن صاحبہ تھیٹر میں ڈرامہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک باپ بیٹا بیٹھے تھے۔ باپ پریشان تھا کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا جبکہ بچہ مزے سے ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ باپ نے پوچھا "تمہیں کیسے نظر آ رہا ہے؟" تو بچے نے کہا "ان کے کان میں جو چھید ہے' وہاں سے پورا اسٹیج نظر آ رہا ہے۔" شاید اسی لیے محترمہ نے اپنے لیے کرسی نہیں مانگی بیٹھنے کے لیے پورا کمرہ مانگا ہے۔ الحمرا انتظامیہ کو کوشش کر کے محترمہ کو سیڑھیوں سے اٹھا کر کمرے میں پہنچانا چاہیے کیونکہ کمرشل تھیٹر کی بہتری کے لیے کمربستہ لوگوں کی بہتری بھی ہونا چاہیے۔ یہاں کمر بستہ سے مراد بستہ ب نہیں الف

بھی نہیں کہ کہیں آپ سمجھنے لگیں' میں الف...... تھیٹر پسند کرتا ہوں۔ بہرحال پنجابی محاورے کے مطابق تو سنی جانے میں زیادہ سے زیادہ بارہ سال ہی لگتے ہیں اور ان کی سیڑھیوں میں بیٹھے 25 سال ہو گئے ہیں۔

○○○

• ان لاء اینڈ آرڈر

اتنا تو ہمیں پتہ تھا کہ گھر جوائی کا گھر میں کوئی ووٹ نہیں ہوتا لیکن شجاع آباد کے سول جج بڑے شجاع نکلے۔ انہوں نے بلدیاتی الیکشنوں میں بھی گھر جوائیوں کے ووٹ مسترد کر دیے۔ یوں اب گھر جوائیوں کو عدالت میں بھی گھر کا سا ماحول ملنے لگا ہے۔

گھر جوائی' خاوند کی بڑی نایاب نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں ان کی بیویاں بیاہ کے اپنے گھر لے جاتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ بڑے فخر امام ہوتے ہیں مگر گھر میں ان کو امام مانا جاتا ہے' نہ ان پر فخر کیا جاتا ہے۔ لوگ تو پہلے ہی ان کے اس قدر خلاف ہیں کہ انہیں ہمیشہ گھر جو....... آئی لکھتے ہیں وہ مرد ہوتے ہیں۔ انہیں آئی کی بجائے آیا کہنا چاہیے۔ ویسے بچوں والے گھر میں انہیں "آیا" ہی سمجھا جاتا ہے لیکن لکھنے میں آج تک گھر جو....... آئی ہی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے دوست ڈاکٹر قریب العزت کے بقول اخباروں والے سابق وزیر تعلیم محمد علی کو "ہوتی" لکھتے ہیں' حالانکہ وہ مرد ہیں۔ چلو اگر یہ فقرہ ہوتا کہ کاش! سابق وزیر تعلیم محمد علی ہوتی تو بندہ مان لیتا کہ کسی دل جلے عاشق کی خواہش ہے۔ پھر مرد بڑے گھر جوائیوں کے خلاف ہیں۔ ہمارے ہوسٹل کے نوکر تو انہیں دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں "جب کسی اچھی کوٹھی میں نوکری ملتی ہے' ہفتے بعد یہ کہہ کر چھٹی ہو جاتی ہے کہ اب آپ کی ضرورت نہیں رہی' ہم نے گھر جوائی رکھ لیا ہے۔"

صاحب! ہم نے تو ملک سے جہیز کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہی طریقہ بتایا تھا کہ اب عورتیں' مردوں کو بیاہ کر لے جایا کریں۔ یوں گھر جوائی دراصل اپنی بیوی کی بیوی ہوتا ہے۔ ہم نے آج تک کسی گھر جوائی کو دوسری شادی کرتے نہیں دیکھا۔ وہ ساس کے زیر سایہ رہتا ہے۔ شاید اسی لیے ہمارے ہاں جب کوئی الٹ

پلٹ باتیں کرنے لگے تو ہم کہتے ہیں' اسے "سایہ" ہو گیا ہے۔ ساس تو خیر آپ گھر جوائی نہ بھی ہوں' تب بھی آپ کو زیر سایہ رکھتی ہے۔ ایک شخص نے کہا "میری شادی کو دس سال ہو گئے ہیں لیکن میری ساس صرف ایک بار میرے گھر آئی ہے۔" دوسرے نے حیران ہو کر کہا "پھر کبھی نہیں آئی؟" اس نے کہا "پھر تو تب آتی' اگر جاتی۔" ہمارے ایک مشہور شاعر کے پاس اولڈ پیپلز ہوم کا مینجر آیا کہ آپ ہمارے ادارے کو کچھ دیں تو اس نے کہا "میں آپ کے ادارے کے لیے ساس دیتا ہوں۔" ہمارے ایک دوست شاعر نے کہا کہ شادی کے بعد میں اپنے سسرال میں رہوں گا۔ ہفتے بعد اپنے ہی کوارٹر میں ملا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا "میں اپنے سسرال میں نہیں رہ سکتا کیونکہ میرا سسر تو ابھی تک خود اپنے سسرال میں رہ رہا ہے۔" اس نے ہمیں بتایا کہ میرا جوائی میری طرح Bachelor ہو سکتا ہے۔ ہم نے پوچھا "آپ تو اکثر شادی شدہ ہوتے ہیں' Bachelor کیسے ہو سکتے ہیں؟" تو انہوں نے کہا "بھئی! یقین کرو...... میں بیچلر ہوں۔ یقین نہ آئے تو یہ ڈگری دیکھ لو' میں بیچلر آف آرٹس ہوں۔" گھر جوائی کام کرنے میں اس قدر ترتیب کا خیال رکھتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر سے دوا پہلے لے آتے ہیں' بیمار بعد میں ہوتے ہیں۔ دفتر سے چھٹی نہیں کریں گے۔ ایک گھر جوائی دو دن دفتر نہ گیا تو افسر نے غصے سے وجہ پوچھی تو شرم سے سر جھکا کر بولا "سر! میری ساس کے ہاں بچہ پیدا ہوا ہے۔" افسر نے غصے سے دیکھا تو گھر جوائی بولا سر! اس بار معاف کر دیں' آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔" گھر جوائی جلدی اپنا قصور مان لیتے ہیں۔ دنیا میں صرف ایک خاتون ہے جو اتنی جلدی کہتی ہے۔ "قصور" میرا ہے اور وہ محترمہ نور جہاں ہیں۔

ویسے ہو سکتا ہے گھر جوائیوں کے ووٹ فلور کراسنگ کی وجہ سے مسترد کر دیئے گئے ہوں کہ وہ مادری پارٹی چھوڑ کر سسرالی پارٹی میں چلے گئے ہیں۔ لیکن جج صاحب نے یہ وجہ بتائی ہے کہ ان کے اپنے گھر میں الگ ووٹ بنے ہوئے ہیں اور سسرال میں الگ۔ حالانکہ ان کے اپنے گھر ہوتے تو وہ گھر جوائی کیوں ہوتے؟ بہرحال ہم اس

حق میں ہیں کہ گھر جوائیوں کو بیویوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ ہمیں تو یہ ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں عورتوں کی طرح گھر جوائیوں کی گواہی بھی آدھی قرار نہ دی جائے جس پر سر کردہ جوائیوں عرفان مروت اور فخر امام صاحب کو آگے بڑھ کر سوچنا چاہیے' سوچ کر آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ ججوں سے بات منوانے کے لیے وکیلوں سے ملنا پڑتا ہے اور بزرگ کہتے ہیں' وکیلوں کو ملنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان دنوں قمیصوں کی جیبیں بائیں جانب عین دل کے اوپر ہوتیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے' یہ ووٹ گھر جوائیوں ہی کے کہنے پر مسترد کیے گئے ہوں کیونکہ صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں ایک بار گھر جوائی ووٹ ڈالنے جانے لگے تو ساس نے کہا "ووٹ کے اصل حقدار پی پی والے ہیں' انہیں ووٹ دینا۔" تو اس نے کہا "ٹھیک کہتی ہیں۔" سسر آیا تو اس نے کہا "غور سے سنو' ووٹ آئی جے آئی کو دینا۔" تو اس نے کہا "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" پاس بیٹھی بیوی نے کہا "بیک وقت دونوں ٹھیک کیسے کہہ سکتے ہیں؟" تو اس نے کہا "آپ بھی ٹھیک کہتی ہیں۔" لیکن ہم یہ بات جج صاحب سے نہیں پوچھ سکتے کیونکہ ایک بار ہمارے ایک دوست نے عدالت میں جج صاحب سے کہہ دیا "ہاؤ آر یو سر؟" تو جج نے کہا "فائن...... 500 روپے" لیکن صاحب ہمیں اصل وجہ کوئی اور لگی ہے کیونکہ سسرال قانون کا گھر ہے جہاں فادر ان لاء' مدر ان لاء' سسٹر ان لاء ہر کوئی ان لاء ہی لاء' جہاں گھر جوائی کو ہمیشہ ان لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال کا سامنا ہوتا ہے۔ یوں وہ اکیلے ہی قانون کے گھر کو چلانے میں لگا رہتا ہے۔ سو ممکن ہے جج صاحب نے پیشہ وارانہ رقابت کی وجہ سے ان کے ووٹ مسترد کر دیئے ہوں۔

○○○

- **فادر سرتاج عزیز**

اتنا تو ہمیں پتہ ہے کہ وزیر خزانہ سرتاج عزیز خواتین میں اس قدر مقبول ہیں کہ ہمارے ہاں خواتین پیار سے اپنے خاوندوں کو سرتاج کہہ کر بلاتی ہیں جس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہر بیوی چاہتی ہے کہ اس کے خاوند کے پاس خزانہ ہو۔

بیویوں کا بس چلے تو ہر خاوند لکھ پتی ہو جائے' وہ خاوند ہو بھی جاتے ہیں جو پہلے کروڑ پتی ہوتے ہیں۔ ہندوستان کی علاقائی فلموں کی ایک اداکارہ کو پتہ چلا کہ اداکارہ پوجا بھٹ لاکھ پتی ہونے والی ہے تو اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "توبہ! توبہ! میرا تو ابھی آٹھواں پتی ہے۔" بہرحال سرتاج عزیز صاحب واحد آدمی ہیں جو ہمیشہ سے عزیز رہے ہیں۔ اب تو اس قدر ہردلعزیز ہو گئے ہیں کہ ایک علی عسکری نامی نوجوان نے انہیں اپنا باپ قرار دے کر اپنی برتھ ڈے کے کارڈ تک چھپوا دیئے لیکن پولیس نے یہ برتھ کنٹرول کر کے سرتاج عزیز صاحب کو باپ بننے سے بال بال بچا لیا۔ ہو سکتا ہے کوئی اعتراض کرے کہ وہ بال بال نہیں بچے کیونکہ اس طرح بچنے کے لیے بالوں کا بچنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ مصیبت کے وقت تو بندہ اپنے والد کو بھی باپ بنا لیتا ہے لیکن اس عمر میں سرتاج عزیز صاحب کو والد بنانے پر ہمارے ایک ماہر امراض ناک' کان اور گلا دوست کو ہی گلہ نہیں کئی حکیموں کو بھی اعتراض ہے۔ صاحب پہلے مغرب سے اکثر ایسی خبریں آیا کرتیں جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ سورج مغرب میں غروب ہوتا ہے اور جہاں سورج غروب ہوتا ہے وہاں وہی ہوتا ہو گا جو سورج غروب ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ امریکہ کے حالیہ سروے کے مطابق ہر دس باپوں میں سے ایک اپنے بچوں کا اصلی باپ نہیں ہوتا۔ پچھلے سال جب ہالی وڈ کے ایک سکول میں ٹیچر نے بچوں کو اپنے والد کا نام لکھنے کو کہا تو چالیس کی کلاس میں سے تیس بچوں کو نقل کرنا پڑی۔ وہاں والدوں کی کمی کا اس سے اندازہ لگائیں کہ جب بروک شیلڈ بچی تھی تو اس نے

اپنی سہیلی سے کہا "تمہارے ابو کیک بہت اچھا بناتے ہیں۔" تو دوسری بچی نے پوچھا "مگر تمہیں یہ کیسے پتہ ہے؟" وہ بولی "اس لیے کہ وہ پہلے میرے ابو رہ چکے ہیں۔"

یہ تب کی بات ہے جب بیرون ملک سے آنے والے ایک عزیز نے کہا "مجھے سکول میں بروک شیلڈ ملی۔" تو ہم نے کہا' آپ کو تو بروک شیلڈ ملی' ہمیں تو سکول سے نئی شیلڈ ملی۔ بہرحال ہم علی عسکری کے معترف ہو گئے ہیں کہ انہوں نے ایک والد پیدا کر کے وہ کام کر دیا جو آج تک کوئی نہیں کر سکا لیکن ہو سکتا ہے' ایک وزیر کو انہوں نے اپنا باپ اس لیے چنا ہو کہ آج کل وزیر کا بیٹا ہونا بادشاہ ہونا ہے اور بادشاہ تو بادشاہ ملکہ تک کوئی کام خود نہیں کرتی۔ ایک ڈرامے کا سین ملاحظہ ہو۔ پردہ اٹھتا ہے' پائیں باغ کا سین ہے۔ بادشاہ اور ملکہ ٹہل رہے ہیں۔ خدمت گار تیزی سے اندر آ کر آداب بجا لاتا ہے اور یہ اطلاع دیتا ہے ملکہ عالیہ مبارک ہو! خدا نے آپ کو چاند سا بیٹا عطا کیا۔" علی عسکری نے سوچا ہو گا' سیاستدانوں کو کونسا یاد رہتا ہے کہ ان کے کتنے بیٹے ہیں' اگر شک بھی ہو تو کہیں گے دھاندلی لگتی ہے' گنتی دوبارہ کرواؤ۔ ہمارے ایک ایم پی اے ایسے ہیں جن کی لکھائی اتنی بری تھی کہ بچپن میں استانی نے کہا "سو بار الف بے لکھ کر لانا۔" جب وہ الف بے لکھ کر لائے' استانی نے گنا تو وہ صرف تیس مرتبہ تھی۔ استانی نے ڈانٹا تو بولے "مس میں نے سو مرتبہ لکھی تھی' دراصل میرا حساب بھی کمزور ہے۔" لیکن سرتاج عزیز صاحب تو حساب میں اتنی دلچسپی لیتے ہیں کہ پٹھان ہوتے ہوئے بھی جب کوئی انہیں کہتا کہ یہ مسئلہ ضرب کے بغیر حل نہ ہو گا تو وہ ضرب لگانے کے لیے ڈنڈا اٹھانے کی بجائے پنسل اٹھا کر ضرب کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اگرچہ کرکٹ میں اوور ہی ہوتے ہیں مگر وہ وہاں بھی کبھی اوور نہیں ہوتے۔ اس قدر سول آدمی ہیں کہ انہیں سرونٹ میں بھی سول سرونٹ ہی پسند ہیں جبکہ علی عسکری صاحب کی اپنی ہسٹری ایسی ہے جیسی ہمارے ایک سندھ کے رکن اسمبلی کی ہے جس نے ایک محقق کو بیس ہزار روپے دیئے کہ وہ اس کے خاندان کی ہسٹری لکھے۔ جب اس نے لکھی تو اس رکن اسمبلی نے اسے چالیس ہزار روپے دیئے

کہ اسے چھاپنا مت لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے علی عسکری نے انہیں کسی اور نیت سے فادر کہا ہو اور ہم جانتے ہیں فادر ہمیشہ کسی نیک اور مقدس شخص کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس سے مراد اپنا والد نہیں لیا جاتا کیونکہ وہ تو ڈیڈی ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے سرتاج عزیز صاحب کو فادر کہہ کر ان کے تقدس کی طرف اشارہ کیا ہو۔

○○○

• ادبی انجمن صاحبہ

لیجئے! اداکارہ انجمن نے بھی اپنے شاعرہ ہونے کا انکشاف کر دیا۔ وہ شاعرہ ہونے کا انکشاف بھی کرتیں تو ہم فوراً مان لیتے۔ ہمیں تو شاعری سے اس قدر لگاؤ ہے کہ ہمیں تو "خوشبو" بھی پروین شاکر کی پسند ہے۔ اب پوری انجمن کے ادب میں آنے سے ہم یہ تو کہہ سکیں گے کہ ہمارے پاس بھی کوئی "بہت بڑی" شاعرہ ہے۔ منٹو نے کہا تھا "چراغ حسن حسرت تو ایک موٹی لغت ہے۔" تو چراغ حسن حسرت نے کہا "اور منٹو ایک فحش ناول کے سوا کیا ہے؟" یوں انجمن صاحبہ لمبی بحر کی غزل تو ہیں مگر دوسرا مصرع وزن سے گرتا ہے۔ سو آج کل اچھی خاصی نثری نظم نظر آتی ہے۔ آپ انہیں دیوان بھی کہہ سکتے ہیں کہ انہیں دیکھنے میں اتنی ہی دیر لگتی ہے جتنی کسی شاعر کا دیوان پڑھنے میں۔ قدم یوں اٹھاتی ہیں جیسے ہم "علی پور کا ایلی" اٹھاتے ہیں۔ شعر سنا رہی ہوں تو لگتا ہے شعر دکھا رہی ہیں' وہ بھی یوں کہ پتہ نہیں چلتا' شعر اور سامعین میں سے کس کس کو کب کب سکتہ پڑا۔

الزبتھ ٹیلر کی سوکن مسز رچرڈ برٹن (اول) نے کہا ہے کہ الزبتھ ٹیلر ہے تو پانچ فٹ دو انچ کی مگر اس کی شخصیت میں ایسا جادو ہے کہ دیکھنے والا خود کو دو فٹ پانچ انچ کا سمجھنے لگتا ہے۔ یہی حال انجمن صاحبہ کو دیکھنے والوں کا ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک بار ایک نئی اداکارہ کو تھپڑ مارا تو اس اداکارہ نے کہا "دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ میں بھی اوپر آ کر تمہیں تھپڑ ماروں۔" وہ آسیہ کے بعد فلموں میں آئی۔ آسیہ ہماری پنجابی فلموں کی سیاہ اور لمبے لمبے بالوں والی ہیروئن تھی' یوں اسے ہر وقت لمبے موزے چڑھائے رہنا پڑتا۔ صاحب! فلم کے لوگ اتنے مشہور ہوتے ہیں کہ آج کل تو بچوں کو تاریخ پڑھاتے وقت نور جہاں کے بارے میں بتانا ہو تو کہنا پڑتا ہے "ہم غیر ترنم نور جہاں

کی بات کر رہے ہیں۔" اکثر استاد تو اب اسے مسز شہنشاہ جہانگیر کہنے لگے ہیں۔ یہی حال اب ہمارا ہے' ہم بھی جب سنتے ہیں کہ فلاں جگہ "ادبی انجمن کا اجتماع" ہے تو ہم سمجھتے ہیں وہاں اداکارہ انجمن جمع ہو رہی ہے۔ ویسے بھی انجمن کے ادب میں آ جانے سے سارا ادبی خلا پر ہو جائے گا بلکہ ممکن ہے انجمن کے آ جانے سے صرف لفظ "ادب" سے گزارا نہ ہو اور اس کی جگہ "آداب" استعمال کرنا پڑے۔ فلمی اداکاراؤں کو شروع سے ہی ادب سے لگاؤ رہا ہے۔ ایک اداکارہ نے اپنے ادبی لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ڈاکٹر علامہ اقبال صاحب سے ہمارے بڑے تعلقات تھے۔ ہمارے ہاں جو بھی بیمار ہوتا' ہم اس کی دوائی ڈاکٹر صاحب کے ہی کلینک سے لاتے۔

سچی بات ہے ہمیں انجمن صاحبہ کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اسی دن اندازہ ہو گیا تھا جب انہوں نے لاہور میں ایوارڈز کی ایک تقریب میں کہا تھا کہ اتنے پڑھے لکھوں کے سامنے میرا بولنا چاند کو چراغ دکھانا ہے۔ صاحب! نقطہ آفرینی ملاحظہ ہو۔ چاند کو چراغ دکھانا یعنی چاند تو سورج سے روشنی لے کر چمکتا ہے جیسے محبوب عاشق کے خرچ پر چلتا ہے۔ سو جس کی گزر بسر سورج پر ہوا' اسے چراغ دکھانا دراصل اس سے مذاق کرنا ہے۔ پھر شروع ہی سے ان کے پاس "انجمن" جیسا تخلص ہیلیکن صرف اس تخلص تلے مشاعرہ ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی نے ایک بار محمد علی جوہر سے پوچھا "آپ کے دو بھائی شاعر ہیں۔ آپ محمد علی جوہر ہوئے' دوسرے بھائی ذوالفقار علی گوہر ہوئے تو تیسرے شوکت علی کیا ہوئے؟" تو مولانا نے کہا "شوکت علی شوہر ہوئے۔" گاندھی جی نے کہا "یہ شاعری میں نہیں چلے گا۔" تو مولانا ے کہا "شوہر شاعری میں چلے نہ چلے گھر میں تو چلتا ہے۔" اگرچہ ہم نے حسب توفیق انجمن صاحبہ کا کلام نہیں سنا جنھوں نے صاحبہ کو "سنا" ہے' وہ کہتے ہیں اچھا کلام کرتی ہے۔ طبیعت تو ان کی شروع ہی سے شاعرانہ رہی۔ ایک بار امیر تیمور نے حافظ شیرازی سے پوچھا "میں نے سمر قند و بخارا کتنی جانوں اور جتنوں سے حاصل کیا اور تم ایک غریب شاعر ہوتے ہوئے اسے اپنے محبوب کے ایک تل پر

نچھاور کر رہے ہو' اپنی حیثیت دیکھی ہے؟" تو حافظ شیرازی نے کہا "حضور! یہ غریبی اسی دریا دلی کا نتیجہ ہے۔" انجمن نے بھی ماں کا "سمرقند و بخارا" اپنے محبوب پر قربان کر دیا۔

صاحب! رقص کو اعضاء کی شاعری کہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے انجمن نے اسی حوالے سے خود کو شاعر کہا ہو۔ اس حساب سے تو اس نے بڑے ہی شاعر گھرانے میں زبانی کھولی۔ گھر میں ہر کوئی ماشاء اللہ صاحب دیوان خاص ہے۔ ویسے بھی شاعری میں دل' جگر' آنکھیں' رخسار اور ہونٹوں یعنی اعضاء کا ہی ذکر رہتا ہے۔ سو دونوں شاعریوں کو اس طرح علیحدہ کر سکتے ہیں کہ جو پاؤں سے کی جاتی ہے' وہ اعضاء کی شاعری ہے۔ اگرچہ کچھ دیوان پڑھ کر یہ تعریف بھی دونوں شاعریوں کو علیحدہ نہیں کر سکتی۔ یوں بھی اب دونوں قسم کے مشاعرے اکثر سامعین ہی لوٹتے ہیں' پھر شاعری بھی تو اب شوبزنس ہی ہے۔ ہمارے سپر اسٹار شاعر اکثر شاعری کی شوٹنگ پر بیرون ملک جاتے رہتے ہیں۔ ممکن ہے انجمن گانا بجانا چھوڑ کر اس "شعری طائفے" میں شامل ہو رہی ہوں جس پر ہمیں خوشی ہے کہ چلو ادب اس مقام پر تو آیا ورنہ اس سے قبل تو یہ حال تھا کہ شاہد احمد دہلوی جیسے نامور ادیب جو رسالہ "ساقی" کے مدیر بھی تھے' انہیں روزی کمانے کے لیے گانا بجانا شروع کرنا پڑتا تھا۔

○○○

• لاء علمی

ہم آج تک یہی سمجھتے رہے کہ لاء علمی ہزار نعمت ہے لیکن آج پتہ چلا کہ یہ سب ہماری لاعلمی تھی۔ ہوا یوں کہ یورپ لائرز ایسوسی ایشن (جھوٹوں کی یونین) نے قانون دانوں کو نااہل قرار دے دیا۔ یہ ایسوسی ایشن ہر سال یورپ میں جھوٹ بولنے والوں کا مقابلہ کرواتی ہے جو جھوٹوں کے بادشاہ اولڈول کی یاد میں ہوتا ہے۔ یہ مقابلہ لندن میں ہوتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ جھوٹوں کو دور سے نہ آنا پڑے۔ اس میں دنیا بھر کے جھوٹے شرکت کر سکتے تھے مگر اس بار انہوں نے شق نمبر 7 میں "آٹھویں ترمیم" کر کے وکیلوں کے دل شق کر دیئے ہیں کہ وہ اس مقابلے میں شرکت نہیں کر سکتے۔

صاحب! پچھلے سال سیاستدانوں کو اس مقابلے میں شرکت کے لیے نااہل قرار دیا گیا تو ہم نہ بولے کہ جھوٹوں کے سامنے بندہ کیا بولے؟ ویسے بھی ایسوسی ایشن کو یہ پریشانی تھی کہ ہر سال سیاستدان ہی یہ مقابلہ جیت جاتے ہیں۔ پچھلے کئی سالوں سے وہاں کا مقامی سیاستدان یہ کہہ کر مقابلہ جیت جاتا کہ میں ہمیشہ سچ بولتا ہوں' یوں اسے دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا مان لیا جاتا لیکن اب تو یہ حالت ہو گئی ہے کہ سیاستدان یہ بھی کہے کہ میں دنیا کا سب سے بڑا جھوٹا ہوں تو کوئی اس کی بات پر یقین نہ کرے گا۔

پچھلے دنوں روسی ریاست ازبکستان کے وزیر تجارت ایک یورپی ملک میں شرٹ چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے۔ پولیس نے پوچھا:

"آپ نے شرٹ چوری کی؟"

کہا "نہیں۔"

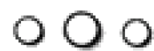
پوچھا "اس سے پہلے کبھی چوری کی کوشش کی؟"

کہا "نہیں یہ پہلی کوشش ہے۔"

لیکن ہمارے ہاں سیاستدانوں کے بارے میں رائے ہے کہ گوجرانوالہ کے جامع سکول کے

ایک استاد نے کہا "اپنے اپنے علاقہ کے ایم این اے کے بارے میں انگریزی میں مضمون لکھیں۔" ایک لڑکے نے "وہ بستر پر لیٹتا ہے۔" کی انگریزی لکھی "He lies on bed" ٹیچر نے پڑھ کر کہا "اس سے لگتا ہے تم انگریزی نہیں جانتے۔" تو لڑکے نے کہا "سر! میں تو انگریزی جانتا ہوں' آپ میرے علاقے کے ایم این اے کو نہیں جانتے۔" ایک پاکستانی صحافی کو پتہ چلا کہ سابق امریکی صدر جارج واشنگٹن نے پوری زندگی کبھی جھوٹ نہیں بولا' تو وہ حیران رہ گیا تو امریکی نے کہا "حیران ہونے کی ضرورت نہیں' امریکہ اور پاکستان میں بڑا فرق ہے۔" تو اس نے کہا "فرق نہ ہوتا تو ایک گونگا وہاں اتنی دیر صدر کیسے رہ سکتا تھا؟" پہلے یہ پتہ نہ چلتا کہ سیاستدان کب سچ بول رہا ہے اور کب جھوٹ' لیکن ایک سیاسی تجزیہ نگار نے کہا "سچ تو پتہ نہیں البتہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ وہ جھوٹ کب بول رہا ہے۔" کسی نے پوچھا "مثلاً کب؟" کہا "جب اس کے ہونٹ ہل رہے ہوں۔" سو صاحب! ایسوی ایشن نے اس ڈر سے کہ ہر سال انعام سیاستدان ہی لے جایا کریں گے' ان کو تو اس مقابلے سے نکال دیا مگر وکیلوں کو نااہل قرار دینا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وکیل جھوٹ نہیں سچ بولتے ہیں۔ جیسے ایک ملزم نے وکیل سے کہا "میرے پاس 50 لاکھ ہیں' کچھ کریں۔" تو وکیل نے کہا "میں یقین دلاتا ہوں اتنے روپوں کے ہوتے ہوئے تم جیل نہیں جاؤ گے۔" واقعی جب وہ جیل گیا تو یہ رقم اس کے پاس نہ تھی لیکن وکیلوں پر سچ بولنے کی پابندی بھی نہیں ہے۔ اسی لیے عدالت میں ہر بولنے والا قسم کھاتا ہے کہ جو کچھ کہوں گا' سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا' سوائے وکیل کے۔ تحقیق کے بعد ہم نے وجہ معلوم کی تو پتہ چلا کہ پیشہ ورانہ جھوٹ بولنے والوں کو مقابلے میں شرکت کی اجازت نہیں۔ اگرچہ اشارہ تو ہم لکھنے والوں کی طرف لگتا ہے جیسے قاآنی نے شہزادے کو فریدون مرزا کے حضور قصیدہ پیش کیا تو شاہزادے نے خوش ہو کر کہا "ہمارا خیال ہے ہم تمہیں اپنا درباری مورخ مقرر کر دیں۔" قاآنی نے یہ

سنا تو بولا "حضور! سچی بات تو یہ ہے کہ میں درباری قصیدہ نگار ہی اچھا ہوں کیونکہ مورخ کو تو سچ لکھنا پڑتا ہے۔" قاآنی کو پتہ تھا کہ بادشاہوں کو دروغ اتنا پسند ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے محلوں میں کئی دروغے رکھے ہوتے ہیں۔ اب "دروغے" جمہوری ہو گئے ہیں یعنی جس طرف زیادہ لوگ ہوں' یہ بھی اسی طرف ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں پچھلی بار جب ایسوسی ایشن نے جھوٹ بولنے والوں سے کہا کہ آپ اپنی درخواست کے ساتھ ڈاکومنٹری ثبوت منسلک کریں کہ آپ کب سے باقاعدہ جھوٹ بول رہے ہیں تو درخواستوں کے ساتھ نکاح ناموں کی نقول منسلک کی جانے لگیں۔ خاوند کو بیوی سے بات کرتے ہوئے دھڑکا لگا رہتا ہے منہ سے کہیں سچی بات نہ نکل جائے۔ پھر بیویاں تو خاوندوں سے بھی زیادہ جھوٹ بولتی ہیں۔ ایک خاتون نے اپنے باس سے شکایت کی کہ میرا کولیگ مجھے بار بار جھوٹ بولنے پر اکساتا ہے۔ باس نے پوچھا "کیسے؟" کہا "بار بار مجھ سے میری عمر پوچھتا ہے۔" سو اگر وکیلوں کو پیشہ ورانہ جھوٹ بولنے پر نااہل قرار دیا جا سکتا ہے تو خاوند بھی اہل قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ ہمیں تو لگتا ہے کہ لائرز ایسوسی ایشن لندن والے ڈرتے ہیں کہ اگر وکیل آ گئے تو لوگ اس لائرز ایسوسی ایشن کو وکیلوں کی یونین سمجھنے لگیں گے۔



• مفت اشتہار برائے تلاش گمشدہ

روزنامہ پاکستان نے اپنی پہلی سالگرہ پر مفت اشتہار چھپوانے کی جو رعایت دی ہے' سوچا ہم بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تلاش گمشدہ کا ایک اشتہار دے ہی دیں۔ صاحب! ہوا یوں کہ پولی ور نتسوگ صاحب 21 دسمبر 1991ء بروز ہفتہ سرخ سویرے اٹھے۔ دن کا آغاز انہوں نے روس کے سفیر کی حیثیت سے کیا۔ بس دوپہر کو ذرا اوپر کے لیے ان کی آنکھ لگ گئی۔ شام کو اٹھ کر کیا دیکھتے ہیں کہ روس غائب ہے۔ ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں رکھ کے نہ بھول گئے ہوں۔ رات ہو گئی مگر کہیں نہ ملا تو انہیں خود پر شک ہونے لگا کہ اتنا بڑا روس کیسے گم ہو سکتا ہے۔ کہیں میں ہی نہ گم ہو گیا ہوں۔ شیشے میں دیکھا تو خود کو موجود پایا' پھر سوچا کہ میں کونسا روس میں ہوں جو گم ہو جاتا اور پھر سے روس کو ڈھونڈنے لگے اور اب تک ڈھونڈ رہے ہیں۔

روس کو کچھ عرصہ قبل فوجیوں نے اغوا بالجبر کرنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے' ہو سکتا ہے وہ ان کے ڈر سے کہیں بھاگ گیا ہو لیکن یہ خیال آتا ہے کہ وہ اتنا فربہ ہے کہ ورلڈ باڈی میں اس کے' اس وقت تین ووٹ تھے' جبکہ ہمارا ایک بھی نہیں تھا۔ اتنا فربہ بھاگ کیسے سکتا ہے؟ کسی دانشور نے تاج محل دیکھ کر حیرانی سے کہا تھا "یقین نہیں آتا' اتنا بڑا منصوبہ امریکی امداد کے بغیر کیسے مکمل ہو سکتا ہے؟" سو صاحب! ہمیں تو اتنے موٹے روس کی گمشدگی میں امریکہ کا ہاتھ لگتا ہے۔

موصوف کا حلیہ ایسا تھا کہ دیکھنے میں ریچھ لگتا ہے اور دیکھنے وال اسی پر ریجھ جاتا ہے۔ پہلے محنت مزدوری کے لیے ہتھوڑا اور درانتی استعمال کرتا۔ پھر اس نے ان کو گھروں' دفتروں اور گلیوں میں لٹکا دیا اور ان کا یہی استعمال رہ گیا۔ جو یہ نہ لٹکاتا' اسے لٹکا دیا جاتا۔ سرخ رنگ اس قدر پسند تھا کہ وہاں سفید پوش بھی وہ ہوتا جو سرخ رنگ پہنتا۔ مارکسزم یعنی مسز روس کے بعد وہاں ہر کسی کے ساتھ یوں سلوک کیا جاتا جیسے وہ زار

روس ہوا اور سب جانتے ہیں' زار روس کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ مسز روس یعنی مارکسزم چینی کی کہاوت کے مطابق سب کی گائے تھی جس کا ہر کوئی دودھ دوھتا مگر کوئی بھی چارہ نہ ڈالتا۔

آخری دنوں میں وہ قطار میں لگ کر روٹی لیتے دیکھا گیا۔ ناشتے کی قطار میں لگتا تو جب باری آتی' لنچ کا وقت وہ چکا ہوتا۔ بہرحال کبھی کبھی ناشتے کے لیے لائن لگتی تو ناشتہ ہی ملتا یعنی اگلے دن۔ اس کا پیٹ بھوک سے اور جیبیں اسلحے سے بھری رہتیں۔ ہر وقت دوسروں کو کھانے کو پڑتا۔ وہاں پہلا سینڈوچ اٹھاوریں صدی میں بنا۔ جس کی نمائش آج بھی پلسیوں میں اپنے ریلوے سٹیشنوں پر کرتا۔ اسے ایک بار کسی نے پوچھا "آپ کی اور امریکہ کی ڈشوں میں کیا فرق ہے؟" تو اس نے کہا "امریکی ڈشیں جلد ٹوٹ جاتی ہیں۔" آخری دنوں میں واڈکا اور غصہ پیتا رہا۔ افغانستان میں تو وہ دن رات غصہ پیتا کہ یہی حرام چیز وہاں مل سکتی تھی۔ بچوں کو تربیت دیتا' تعلیم نہ دیتا۔ وہاں بچوں کو یہ بتانے کے لیے کہ انڈہ کیا ہوتا ہے؟ امتحان کا نتیجہ دکھایا جاتا۔ ایک بار وہاں ایک بچے کو' استانی کو مرغی کہنے پر سکول سے خارج کر دیا گیا۔ بچے کے والدین نے پوچھا "یہ کیا کیا تم نے؟" بچے نے کہا "اس میں میرا کیا قصور' وہ خود ہی ہر بار مجھے امتحان میں انڈہ دیتی تھی۔"

سگریٹ اسے بہت پسند تھے کہ وہ "ایمبیسی" سے بھی مراد سگریٹ ہی لیتا لیکن سگریٹ نوشی کم کرنے کے لیے اس نے ایسی ماچسیں بنائیں کہ پوری ایک ماچس سے صرف ایک سگریٹ لگایا جا سکتا۔ وہ بھی اس صورت میں کہ پہلے ماچس کو آگ سے سلگایا جاتا۔ کسی کی ماچس پہلی بار جلا اٹھتی تو کے جی بی والے پکڑ لیتے کہ تمہارے پاس امریکی ماچس کہاں سے آئی؟ آخری بار خبر رساں ایجنسی "تاس" کے حوالے سے اس نے بتایا کہ چونکہ بچوں کا دودھ بنانے والی فیکٹریاں بند ہونے سے بچوں کو پینے کا دودھ نہیں مل رہا' سو بچوں کو پینے کے لیے کچھ تو ملنا چاہیے اور اس نے بچوں کو سگریٹ کے پرمٹ

دینے شروع کر دیئے۔

یہ بوڑھا گزشتہ ستر برسوں سے عجیب ہو گیا ہے۔ جیسے غنی کاشمیری صاحب گھر میں ہوتے تو تالہ لگا کر رکھتے اور جب باہر جاتے تو دروازہ کھلا چھوڑ جاتے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو کہا "اس گھر کی سب سے قیمتی چیز میں ہوں' اس لیے جب گھر میں ہوتا تو اپنی حفاظت کے لیے تالا لگا کر رکھتا ہوں۔" وہاں بھی ہر کوئی اپنی حفاظت کے لیے اندر سے تالہ لگا کر رکھتا۔ ایک بار کسی نے پاکستانی سے پوچھا "آپ کس میں سوتے ہیں؟" کہا "اپنے کمرے میں۔" امریکی سے پوچھا تو اس نے کہا "میں انڈرویئر میں سوتا ہوں۔" روسی سے پوچھا تو اس نے کہا "میں روٹی کے لیے لگی قطار میں سوتا ہوں۔" ہو سکتا ہے روس کو جلا وطن کر دیا گیا ہو کیونکہ ایک بار جب مشہور روسی ادیب کو جلا وطن کیا گیا تو اس نے مغربی صحافیوں کو اپنے تاثرات بتاتے ہوئے کہا تھا کہ آج سے روس کو جلا وطن کر رہا ہوں۔ سو ممکن ہے وہ تب سے ہی جلا وطن ہوا اور یولی ورنتسوف نے 21 دسمبر 1991ء کی صبح جسے دیکھا ہو' وہ کوئی اور ہو۔

مصدقہ اطلاعات کے مطابق اسے آخری بار گوربا چوف کے ساتھ بھیک مانگتے دیکھا گیا تھا۔ صدر گوربا چوف نے اقتدار میں آتے ہی کہا تھا "رئیسہ میں تبدیلی چاہتا ہوں۔" اور رئیسہ نے ڈر کر دن میں بار بار میک اپ کرنا شروع کر دیا تھا۔ سنا ہے گوربا چوف وہاں کا بہت بڑا آدمی تھا۔ لیکن وہاں کے ایک فوجی نے کہا "وہ تو بمشکل پانچ فٹ دو انچ کا ہو گا۔" تازہ ترین اطلاعات کے بعد مسمی روس گوربا چوف کے پاس بھی نہیں ہے۔

سو قارئین! یولی ورنتسوف بہت پریشان ہے۔ آپ میں سے کسی نے روس کو آتے جاتے دیکھا ہو تو فوراً اطلاع کر کے شکریئے کا موقع دیں۔ اطلاع دینے والے کو شکرانے کے طور پر ہتھوڑا اور درانتی پیش کی جائے گی۔"

• محمد دین دھاندلی

لاہور کے محمد دین صاحب گزشتہ 25 برسوں سے الیکشن لڑ رہے ہیں اور ہر بار نئے شاندار طریقے سے ہارتے ہیں۔ اگلی بار پھر مخالف امیدوار منتیں کر کے انہیں کھڑا کر دیتے ہیں کہ آپ ہمارے مقابلے میں کھڑے نہ ہوئے تو ہمارے لیے جیتنا مشکل ہو جائے گا۔ اب تو ان کے گھر والے بھی اکثر انہیں کھڑا ہی رکھتے ہیں۔ کسی کے گھر بھی جائیں تو اس خوف سے بیٹھ نہیں پاتے کہ کہیں کوئی افواہ نہ پھیلا دے کہ محمد دین دھاندلی بیٹھ گئے ہیں۔ حافظہ ایسا ہے کہ اپنی ہر غلطی یاد رکھتے ہیں۔ اپنی شادی کی تاریخ تک یاد ہے۔ جو غلطی ایک بار کر لیں' وہ دوبارہ نہیں کرتے' نئی کرتے ہیں۔ تقریر کا اس قدر شوق کہ ان سے پوچھو "آج کیا تاریخ ہے" تو اس کا جواب بھی مغلیہ تاریخ سے شروع کریں گے۔ راتیں جاگ جاگ کر الیکشن لڑتے ہیں۔ دن کو جاگ کر لڑتے تو شاید نتیجہ مختلف ہوتا۔ لیڈرانہ خوبیاں پولیس نے ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ کسی نے کہا "لگتا ہے آپ اس لیے ہر بار ہار جاتے ہیں کہ علاقے میں آپ کو جاننے والے کم ہیں۔ "کہا" جاننے والے کم ہوتے تو میں جیت نہ جاتا۔"

گوجرانوالہ کے ایک امیدوار شریف ہاتھی صاحب ہیں۔ اگرچہ ہاتھی ان کا انتخابی نشان ہے لیکن اب وہ خود اپنا انتخابی نشان ہو گئے ہیں۔ چڑیا گھر بھی جانے کے لیے انہیں دو ٹکٹ لینے پڑتے ہیں۔ ایک اندر آنے کے لیے اور ایک باہر جانے کے لیے۔ اگرچہ ان کی اپنی صحت ایسی ہے کہ وہ گزر رہے ہوں تو لوگ کہتے ہیں "ہاتھی گزر گیا "شریف" باقی رہ گیا۔" طبیعت اس قدر "الیکشیانہ" پائی ہے کہ شادی کرنے سے پہلے سسرال کے بارے میں انہوں نے صرف یہ پتہ کرایا کہ ان کے گھر کے ووٹ کتنے ہیں؟

اب تو موصوف کے گھر بھی جاؤ تو یہی لگتا ہے کہ شادی کے بعد بس "ووٹ" ہی بنائے ہیں۔ اس لیے گھر میں بھی یوں آتے ہیں جیسے الیکشن کمپنین پر آئے ہوں۔ اس قدر

جوشیلے کہ دوران تقریر سر سے ٹوپی اتار کر حاضرین کے قدموں میں رکھ دیتے ہیں۔ کبھی تو اس قدر جلدی کرتے ہیں کہ ٹوپی میں سے اپنا سر نکالنا ہی بھول جاتے ہیں۔ لاہور تک ووٹ مانگنے آتے ہیں۔ فلمی اداکاراؤں کے پاس گئے۔ کسی نے پوچھا "یہ تو آپ کے حلقے میں نہیں ہیں۔" کہا "اسی لیے تو ان کے پاس جاتا ہوں تاکہ میرا حلقہ بھی وسیع ہو۔" جیسے ہمارے ایک دوست پہلے "ستارہ" کی طرف مائل ہوئے' پھر "چندا" پسند کرنے لگے' زہرہ سے بھی عشق بازی ہوئی۔ ہم نے پوچھا "آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" کہا "پورا نظام شمسی تسخیر کرنا چاہتا ہوں۔" سو وہ بھی اونچے عزائم رکھتے ہیں۔ لہجہ ایسا کہ سیاست کو "سیاہ ست" کہتے۔ کبھی لگتا "ساہ ست" کہہ رہے ہیں۔ لین دین کے ایسے کہ اگر کسی بھکاری کو چونی بھی دے دیتے تو وہ آگے سے "شکریہ" کہنے کی بجائے "شکر ہے۔" کہتا۔ ایک بار پاگل بھی ہو گئے تھے مگر کہتے "جب میں پاگل ہوا تو جو بھی ملنے آتا' اسے پتہ نہ چلتا۔" ہر کوئی کہتا "تم تو پہلے کی طرح ہی ہو۔" لیکن اس بار انہوں نے اپنے ہارنے کا ریکارڈ توڑ دیا۔ ہمیں پتہ چلا ہے کہ اس بار وہ نہیں ہارے۔ ہم نے پوچھا "یہ معجزہ کیسے ہوا؟" کہا "اس بار میں اس لیے نہیں ہارا کہ اس بار میں نے الیکشن لڑا ہی نہیں۔" لیکن محمد دین دھاندلی صاحب نے اس بار بھی اپنا معیار برقرار بلکہ بے قرار رکھا۔ ان کے حلقے کے لوگ بھی ان سے مطمئن ہیں۔ ایک اطمینان نامہ ملاحظہ ہو "انہوں نے ایک ماہ ہمارے لیے کام کیا' اب وہ ہمارے لیے کام نہیں کر رہے۔ ہم مطمئن ہیں۔"

وہ جتنی محنت سے مسلسل ناکام ہو رہے ہیں' اتنی محنت ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ امریکہ میں ایک امیدوار 20 سال تک ناکام ہوا تو اس نے کہہ دیا کہ ووٹروں کی عمر 18 سال سے کم کر دی جائے کیونکہ اٹھارہ سال کے بعد ووٹر سیانے ہو جاتے ہیں۔ تو امریکی پارلیمنٹ کے رکن نے کہا کہ اگر یہ ہو گیا تو پھر امریکہ کے تین بڑے مسئلے ہوں گے۔ صدام حسین' افراط زر اور کیل مہاسے۔ کچھ لوگوں نے ابھی سے محمد دین

دھاندلی صاحب پر شک و شبے کا اظہار شروع کر دیا ہے کہ وہ مسلسل ہار نہیں رہے' جیت رہے ہیں۔ جیسے پچھلے دنوں لاہور کے ایک افسر نے بیٹے کے امتحان میں کامیابی پر پارٹی دی اور بتایا گیا کہ یہ فرسٹ آیا ہے۔ کسی نے کہا چالیس لڑکوں کی کلاس میں اس کی تو انتالیسویں پوزیشن تھی' فرسٹ کیسے آیا؟ تو آفیسر نے کہا کہ وہ کلاس میں ایک لڑکے سے فرسٹ آیا ہے۔ سو ایسے ہی محمد دین دھاندلی صاحب پچھلی بار سات مخالف امیدواروں میں سے ایک سے جیتے تھے۔ سنا ہے ایک بار تو محمد دین دھاندلی صاحب کو کہا گیا کہ ہم آپ کے مقابلے میں کسی امیدوار کو کھڑا نہیں ہونے دیتے' اس طرح آپ جیت جائیں گے تو دھاندلی صاحب نے کہا "جب میرے مقابلے میں ہی کوئی نہیں ہو گا تو پھر میں جیتوں گا کس سے؟" صاحب 25 سال مسلسل ہار کون برداشت کرتا ہے۔ سو ہمیں ڈر ہے کہ کہیں لوگ سازش کر کے انہیں جتوا نہ دیں۔ یوں وہ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ تک پہنچتے پہنچتے رہ نہ جائیں۔ سو انہیں ابھی سے محتاط ہو جانا چاہیے' کہیں چلنے والے دھاندلی سے انہیں جتوا کر ان کے کرائے پر پانی نہ پھیر دیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ تحریک استقلال کے اصغر خان صاحب سے بھی ہوشیار رہیں کیونکہ پاکستان میں وہی ان کا ریکارڈ توڑ سکتے ہیں۔

○○○

• محترمہ بمقابلہ صاحبہ

پچھلے دنوں اسلام آباد میں ایک تقریب ہوئی جس میں کہا گیا کہ ریڈیو کو نجی شعبے میں دے دیا جائے۔ حالانکہ ریڈیو والے تو پہلے ہی اسے اپنا نجی شعبہ سمجھتے ہیں۔ اسے نجی شعبے میں دینے کی وجہ ایک مقرر نے جو بتائی ہے' وہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ فرماتے ہیں "چونکہ سرکاری شعبے میں ریڈیو بے نظیر بھٹو صاحبہ کو محترمہ کی بجائے اب صاحبہ کہنے لگا ہے' اس لیے اسے نجی شعبے میں دے ہی دیا جائے۔"

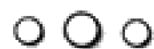
اگرچہ ریڈیو میں ہمیں یہی خرابی نظر آتی ہے کہ جب بھی اسے لگاؤ بولنے لگتا ہے۔ ریڈیو کے موجد ایڈیسن سے کسی تقریب میں ایک خاتون نے کہا کہ آپ نے بڑا کارنامہ انجام دیا جو دنیا کی سب سے پہلی بولنے والی مشین بنائی۔ ایڈیسن نے کہا "محترمہ دنیا کی پہلی بولنے والی مشین تو خدا نے حضرت آدم کی پسلی سے بنائی۔ ہاں میں نے جو بولنے والی مشین بنائی ہے' اس میں آن آف کے بٹن ہوتے ہیں۔" یوں بھی ہمارے ہاں ریڈیو کی زیادہ سے زیادہ تعریف یہی ہو سکتی ہے کہ وہ بی بی سی ہے یعنی بی بی کی طرح ہے۔ اسی لیے کسی سیانے نے کہا تھا "بیوی کی تلاش میں نکلو تو آنکھوں کی بجائے کان استعمال کرو کیونکہ بیوی وہ بی بی سی ہے جسے آپ نے اتنا دیکھنا نہیں' جتنا سننا ہے۔" ملٹن بارلی نے تو یہ کہہ دیا کہ میں اس وقت سے ٹی وی پر ہوں' جب یہ ریڈیو ہوتا تھا۔ ہمارے ایک دوست آج بھی ریڈیو کو ترجیح دیتے ہیں اور اسے فل آواز میں لگا کر پڑھتے ہیں۔ ہم نے اس کی وجہ پوچھی تو کہنے لگے "ریڈیو فل آواز میں لگا ہو تو پڑھتے وقت باہر گلی کا شور ڈسٹرب نہیں کرتا۔" آج کل ہر چیز نجی شعبے میں دی جا رہی ہے۔ سرکاری شعبہ تک نجی شعبے کو دیا جا رہا ہے۔ ریڈیو بھی آہستہ آہستہ نجکاری کے کاری وار سہہ رہا ہے۔ اس پر ایک مزاحیہ فنکار نے تبصرہ کیا تھا کہ مجھے مکان تو پیش کرنا چاہیے مگر ایک ایک اینٹ کر کے۔ ریڈیو کو نجی شعبے میں

دینے کی یہ وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ بینظیر بھٹو کو صاحبہ کہتا ہے۔

ہمیں تو بظاہر محترمہ اور صاحبہ میں املا کا فرق ہی ملا۔ یا یہ کہ ایک نام سے پہلے لگتا ہے' دوسرا نام کے بعد لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ نام کے بعد صاحبہ لگانے کا یہ مطلب تو نہیں کہ بعد میں عزت ملی۔ مرد و زن کے احترام کے لیے ہمارے ہاں کئی لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ انگریزی میں خواتین کے لیے لفظ "میڈم" استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی میں تو اس سے مراد شادی شدہ عورت ہے لیکن اردو میں چونکہ اس کا ترجمہ ہے مادام' چونکہ اس میں لفظ دام آ گیا ہے۔ سو ہمارے ہاں فلم انڈسٹری میں خواتین مادام کہلاتی ہیں۔ غیر شادی شدہ کو مس کہتے ہیں۔ ایک ممتاز عالم دین نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں مس وہ ہوتی ہے جسے کسی نے مس نہ کیا ہو جبکہ مغرب میں مس وہ ہوتی ہے جسے کسی نے مس نہ کیا ہو۔ مردوں کے لیے ہمارے ہاں صاحب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ سکھ تو اسے مقدس سمجھتے ہیں کہ جو چیز قابل احترام لگے' اسے صاحب کہنے لگتے ہیں۔ جیسے دربار صاحب' گرنتھ صاحب۔ اسی لیے ایک دوسرے کو صاحب کہہ کر نہیں بلاتے۔ سو صاحبہ بھی ایسا ہی قابل احترام لفظ ہے۔ ہمارے ہاں شادی شدہ "صاحبہ" اور جو شادی سے بھاگے "صاحباں" ہوتی ہے۔ سو اگر ریڈیو اب بے نظیر بھٹو کو صاحبہ کہنے لگا ہے تو ہو سکتا ہے اس کا اشارہ ان کی نجی زندگی کی طرف ہو۔ اس حساب سے تو ریڈیو پہلے ہی سرکاری سے نجی سطح پر اتر آیا ہے۔

مغرب میں میڈم' لیڈی' مس اور سر وغیرہ کے الفاظ نام سے پہلے ہی کہے جاتے ہیں جس کی وجہ وہاں کے ہیر اسٹائل اور لباس ہیں کہ بعض اوقات تو صرف نام ہی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آئی ہیں یا آئے ہیں۔ ہمارے ہاں احترامی الفاظ زیادہ تر بعد میں لگائے جاتے ہیں۔ سو ہو سکتا ہے صاحبہ کہہ کر ریڈیو والوں نے بے نظیر بھٹو کو مغربی سے مشرقی بنانے کی کوشش کی ہو۔ ویسے بھی مغرب میں نام کے آخر میں آنے والا لفظ ہی بلانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے انگریزوں کے نزدیک نیر علی دادا اور آصف علی پوتا دونوں دادا' پوتا ہیں۔ اسمبلی میں صدر صاحب کی تقریر کے دوران بے نظیر صاحبہ

کی "پرفارمنس" دیکھ کر تو لگتا ہے "صاحبہ" سے مراد کوئی فلمی نام ہی نہ ہو۔ بہرحال ہماری سیاستدان خواتین کی بڑی خواہش رہتی ہے کہ انہیں صاحبہ کہا جائے۔ دروغ برگردن راوی کے ایک بار ایک ملازم نے شاہین عتیق الرحمن کو صاحب کہہ دیا تو بیگم عابدہ حسین نے ملازم کو ڈانٹتے ہوئے کہا "عورتوں کو صاحب نہیں' صاحبہ کہتے ہیں۔" اس ملازم نے بیگم عابدہ حسین کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "معافی دے دیں' آئندہ غلطی نہیں ہو گی بیگم صاحب!"



• شیخیا ں

شیخ رشید صاحب کے نام کے پہلے حصے کا تو فلم انڈسٹری میں پہلے ہی بڑا حصہ ہے۔ گزشتہ ایک دو سالوں سے تو بڑے بڑے "فن کار" خود کو شاگرد رشید کہنے لگے ہیں۔ یاد رہے یہاں سالوں سے مراد کوئی رشتہ نہیں' مدت ہے۔ پھر وہ امریکہ جس کے بارے میں ہماری معلومات کا یہ عالم ہے کہ ایک وزیر خارجہ سے کسی نے پوچھا "نیو جرسی" کہاں ہے؟ تو انہوں نے کہا "میں نے الماری میں رکھی تھی۔" اب شیخ رشید صاحب کی بدولت یہ عالم ہے کہ ہمارے علماء تک امریکی گلوکاروں کو جاننے پہچاننے لگے ہیں۔ کسی مولوی سے بھی پوچھ لو کہ "مائیکل جیکسن کیا گاتا ہے؟" ہر مولوی بتا دے گا کہ وہ جو گاتا ہے وہ "پاپ" ہے بلکہ اب تو شیخ رشید صاحب اور پی پی کے پیدائشی نائب صدر شیخ رشید صاحب میں فرق کرنے کے لیے لوگ انہیں "شیخ رشید مائیکل جیکسن والے" کہہ کر بلاتے ہیں لیکن صاحب! آسمان سے دیکھا نہ گیا اور 1992ء کی پیشن گوئیاں کرنے والے ایک ماہر فلکیات نے تو ان پر آسمان ہی گرا دیا۔ ہم سمجھتے تھے ماہر فلکیات ستاروں کا علم رکھتے ہیں لیکن وہ تو فلمی ستاروں کے عالم نکلے۔ اگرچہ فلمی ستاروں کو پڑھنا ہماری غیر حسابی سرگرمیوں میں شامل ہے۔ ایک بار کشور کمار اور سعادت حسن منٹو بیٹھے تھے کہ "مشہور شبانہ" رقاصہ پارو گزری۔ اس کی جلد دیکھ کر کشور کمار نے کہا "منٹو صاحب! دیکھئے کیسی جلد ہے؟" تو سعادت حسن منٹو نے کہا "جلد ہی نہیں' کتاب بھی اچھی ہے۔" لیکن اس ماہر فلکیات نے پتہ نہیں کون سی کتاب پڑھ لی ہے جس کے مطابق 1992ء میں مائیکل جیکسن آواز سے محروم ہو جائے گا۔

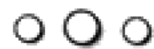
مائیکل جیکسن دیکھنے میں تو ایسا ہے کہ ایک اداکارہ نے کہا تھا' اگر میرا چہرہ ایسا ہوتا

تو میں اپنے ماں باپ پر ہرجانے کا دعویٰ کر دیتی لیکن مائیکل جیکسن وہ فنکار ہے جس کی تصویر کیمرہ نہیں' مائیک بناتا ہے۔ یہ وہ بلیک سنگر ہے جس کے شوز کی ٹکٹیں گوروں میں بلیک ہوتی ہیں۔ جب وہ گاتا ہے تو اس کے سارے جسم میں بجلی کی لہر دوڑ رہی ہوتی ہے' صرف چہرے پر لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے۔ رنگ ایسا کہ اس کا رنگین والیم دیکھ رہے ہوں تو لگتا ہے بلیک اینڈ وائٹ دیکھ رہے ہیں۔ گا رہا ہو تو لگتا ہے ہے گا رہی ہے۔ اس کے گانوں کی یہ خوبی ہے کہ گانا سمجھ میں آئے نہ آئے' گانے والا سمجھ میں آ رہا ہوتا ہے۔ اس کا اترا لباس لاکھوں ڈالرز میں بکتا ہے جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مائیکل جیکسن کے لباس مرد عورت کوئی بھی پہن سکتا ہے بلکہ وہ بھی پہن سکتا ہے جو عورت' مرد نہ بھی ہو۔ بہرحال اس سے یہ ہوا کہ ہالی وڈ کی بعض اداکارائیں بھی لباس پہننے لگی ہیں تاکہ بعد میں اسے بھی بیچ سکیں۔ مائیکل جیکسن کی ایک جڑواں بہن بھی ہے لیکن دونوں میں فرق با آسانی کیا جا سکتا ہے جس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں ہیں' وہ بہن ہے۔

کہتے ہیں شیخ رشید صاحب مائیکل جیکسن کو نوجوانوں کو خوش کرنے کے لیے پاکستان بلا رہے ہیں حالانکہ وہ پاپ سنگر ہے اور پاپ میوزک اتنا اونچا ہوتا ہے کہ لگتا ہے یہ بوڑھوں کے سننے کے لیے ہے کیونکہ وہی اونچا سنتے ہیں۔ امریکن راک سنگر سٹوباٹوز نے کہا ہے "اگر میری آواز آپ کے لیے بلند ہے تو آپ میرے لیے بہت بوڑھے ہیں۔" بہرحال ایک کن میلئے نے گاہک کے کان سے میل نکالتے ہوئے کہا تھا کہ "اس Sin گر کو یہاں ہماری روزی پر لات مارنے کے لیے بلایا جا رہا ہے۔"

پاپ میوزک کا آغاز اور انجام بڑے مزے کا ہوتا ہے اور یہ مزہ کئی گنا ہو جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔ جوزف ہوفمین نے کہا ہے کہ دنیا میں جتنے بھی شور ہیں' ان میں سب سے مہنگا شور میوزک ہے۔ امریکن راک سٹار فرانک ذاپا نے کہا ہے کہ پاپ نئی پالیسیکس ہے۔ اس میں ہمارے سیاستدانوں کے بیانوں سے زیادہ صداقت پائی جاتی ہے۔ وہ مزید کہتا ہے کہ جب کوئی بہت برا میوزک بجا رہا ہو' سمجھ لیں وہ

یہ بتا رہا ہے کہ سیاست کتنی بری ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے شیخ صاحب بھی سیاست میں کوئی ایسا میوزیکل انکشاف کرنا چاہ رہے ہوں لیکن پیش گوئیاں کرنے والوں بلکہ پیش گویاں کرنے والوں کے بارے میں ہسٹری وارڈ بجز کہتا ہے کہ وہ آنے والے کل کی بات سچ بھی بتاتے ہیں۔ تب بھی ان پر چوری کا کیس تو ہونا چاہیے کہ انہوں نے خدا کی خفیہ اطلاعات چرائیں۔ ویسے اگر مائیکل جیکسن کی آواز بلند بھی ہو گئی تو بھی ان کا دورہ پاکستان دور نہیں پڑے گا۔ اگرچہ شیخ صاحب کی آواز ایسی ہے کہ ٹیلی فون پر بات کر رہے ہوں تو سننے والے کو لگتا ہے کہ ہاتھ میں میگافون پکڑا ہوا ہے۔ وہ تو ہاتھ میں سگار بھی یوں پکڑے ہوئے ہوتے ہیں جیسے مائیک پکڑا ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ مائیک پکڑا ہو تو لگتا ہے ابھی اس کا کش لگانے لگیں گے۔ یونیورسٹی جلسوں کے دوران مائیک خراب ہو جاتا تو جب تک نیا مائیک آتا' شیخ صاحب سے کام چلایا جاتا۔ سو یہاں بھی وہ مائیکل جیکسن کے لیے پلے بیک پاپی (پاپ گانے والا) کے فرائض انجام دے سکتے ہیں اور یوں یہ پہلی بار ہو گا کہ کوئی پاکستانی سیاستدان کسی امریکی کے پلے بیک میں بول رہا ہو گا۔



• مچھلیاں پکڑنا

ہمیں اتنا تو پتہ تھا کہ غلام حیدر وائیں صاحب کو بچپن ہی سے مچھلیاں پکڑنے کا بڑا شوق رہا ہے مگر یہ پتہ نہ تھا کہ وہ وزیر اعلیٰ بھی مچھلیاں پکڑنے کے لیے بنے ہیں۔

ایک تو ان کی طبیعت ایسی ہے کہ کوئی ان کے پیچھے بھی چل رہا ہو تو سمجھتے ہیں' پیچھا کر رہا ہے۔ لطیفہ تک یوں سنتے ہیں جیسے کسی کی تکلیف سن رہے ہوں۔ سو انہوں نے مچھلیاں پکڑنے کی مہم اس "سنجیدگی" سے چلائی ہے کہ اب تو انتظامیہ والوں کو جہاں "پانی" ملے' وہیں کنڈی لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ کچھ تو دفتروں میں بھی کنڈی لگا کر بیٹھنے لگے ہیں۔

وہ دیانتدار آدمی ہیں' اسی لیے ان کے پاس صرف دیانت ہی ہے۔ ایک ایم پی اے نے بتایا کہ دولت کمانے کے لیے سو طریقے ہیں لیکن ایمانداری کا طریقہ ایک ہی ہے۔

ہم نے پوچھا' "وہ کونسا؟" کہا "مجھے نہیں پتہ۔" سو وائیں صاحب جیسے دیانتدار کو جتوانے کے لیے تو ہم خود چار پانچ ووٹ ڈالنے کے لیے تیار ہیں۔ ملاوٹ کے وہ اس قدر خلاف ہیں کہ بولتے وقت اردو میں پنجابی کی ملاوٹ نہیں کرتے۔ اس لیے پنجابی بول رہے ہوں تو خالص پنجابی بول رہے ہوتے ہیں۔ جب اردو بول رہے ہوں تو بھی خالص بول رہے ہوتے ہیں یعنی خالص پنجابی۔ اگرچہ آج کل ملاوٹ کہاں؟ ہم نے ایک شخص سے کہا کہ سنا ہے تم دوائیوں میں ملاوٹ کرتے ہو؟ کہا "غلط...... ہماری دوائیاں تو سو فیصد خالص ہوتی ہیں۔" واقعی کیپسولوں میں خالص مکئی کا آٹا بھرتے ہیں لیکن پھر بھی جب وائیں صاحب ملاوٹ کے خلاف مہم کا اعلان کرتے ہیں تو اسلم ہیجڑا برادری کئی کئی دن گھروں سے باہر نہیں نکلتی کہ کہیں انہیں ملاوٹ میں نہ دھر لیا جائے۔ ہم یہاں تک ڈرتے ہیں کہ کہیں نوابزادہ نصراللہ خان صاحب کو کوئی جماعتوں کی ملاوٹ سے "اتحاد" بنانے پر نہ پکڑ لیا جائے لیکن اب پتہ چلا وائیں صاحب تو یہ سب پانی پانی کرنے

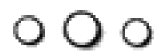
کے لیے کر رہے تھے کیونکہ مچھلیاں پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں اور وہ "مچھلیاں" پکڑے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہم انہیں کیا کہہ سکتے ہیں کہ ذرا سی بات پر ان کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتی ہیں۔ بہرحال اتنا پتہ ہے کہ انہیں مچھلیاں کھانے کا شوق نہیں ہے۔ ان سے پوچھو کہ آپ کو کونسی ڈشیں پسند ہیں تو کہیں گے "سٹیل کی ڈشیں بہتر ہوتی ہیں۔" فضول خرچی کے اس قدر خلاف ہیں کہ وہ مچھلیاں بھی کنڈی کو کنیچوا لگائے بغیر پکڑنا چاہیں گے۔ ویسے وہ اگر کینچوا پانی میں لٹکائے بیٹھے ہوں تو یقین کر لیں کہ وہ مچھلیاں پکڑنے نہیں، کینچوا ڈبونے بیٹھے ہوں گے۔

وقت گزاری اور بیکار رہنے کے جتنے بھی طریقے ہیں، ان میں سے سب سے مہذب مچھلیاں پکڑنا ہے۔ سموئیل جانسن کے نزدیک تو فشنگ کے لیے صرف ایک ڈوری چاہیے جس کے ایک سرے پر کانٹا اور دوسرے پر ایک بیکار ہوتا ہے۔ پہلے بیکار ہوتا ہو گا، اب تو کار والا ہوتا ہے۔ اگر مچھلی ڈوری کے ایک سرے پر لگے کینچوے کو منہ نہیں مارتی تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ اسے یہ پتہ نہ ہو کہ کینچوا ڈوری کے کس سرے پر ہے۔ مچھلیاں پکڑنا ایسا ہی ہے جیسے اپنی غلطیاں پکڑنا۔ جارج رخشن کے بقول تو دنیا میں کوئی آدمی چاہے وہ کتنا ہی عظیم اور طاقتور کیوں نہ ہو، اتنا آزاد نہیں ہو سکتا جتنی مچھلیاں ہوتی ہیں۔ مچھلی کو دیکھ کر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ بندہ ساری عمر نہاتا رہے، پھر بھی تب تک صاف نہیں ہو سکتا جب تک اندر سے صاف نہ ہو۔ پنجاب کے لوگوں کو تو مچھلیوں سے اس قدر محبت ہے کہ انہیں جس سے محبت ہو، اسے "ماہی" کہتے ہیں بلکہ ہم تو بڑی مدت تک محکمہ ماہی پروری کو محبوب کی پرورش سمجھتے رہے۔ مچھلی پکڑنے کا سارا مزہ اس میں ہے کہ مچھلی پکڑا نہیں جاتا، پکڑی جاتی ہے۔ سو اسی لذت کے لیے بندہ سارا سارا دن کنڈی ڈال کر بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی تو "مچھلی" کے لیے مہینوال کو "پٹ" چیرنا پڑتا ہے۔

اگرچہ مچھلیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ واحد جاندار ہے جنہیں کھانے سے

پہلے ذبح نہیں کرنا پڑتا۔ وائیں صاحب ان کو ذبح کرنے کے موڈ میں ہیں لیکن ان کی نظر عام مچھلیوں پر نہیں مگر مچھلیوں پر ہے۔ وہ کنڈی سے شارک پکڑنا چاہتے ہیں۔ شارک پکڑنے والے ایک شکاری نے کہا "شکار کے معاملے میں" میں ہمیشہ خوش قسمت رہا ہوں۔" پوچھا "کیا تمہیں ہر بار شارک ملی؟" کہا "نہیں' اس لیے کہ مجھے کبھی شارک نہیں ملی۔"

کہتے ہیں ترقی کرنے کے دو طریقے ہیں' ایک یہ کہ بندہ اپنی صلاحیتوں اور عقل سے فائدہ اٹھائے اور دوسرا یہ کہ بندہ دوسروں کی جہالت اور حماقتوں سے فائدہ اٹھائے۔ ہمیں دوسرا طریقہ پسند ہے۔ یہی اصول مچھلیاں پکڑنے کا ہے کہ بندہ آرام سے کنڈی پانی میں ڈال کر بیٹھا رہتا ہے' مچھلیاں خود آ کر پھنستی ہیں۔ شاید اسی لیے ملاوٹ کرنے والوں کو پکڑنے کی اس مہم کو وائیں صاحب نے مچھلیاں پکڑنے کی مہم کہا ہے کہ پکڑنے والے کو تو چپ کر کے انتظار کرنا ہوتا ہے۔ باقی جو کچھ کرنا ہوتا ہے' وہ تو مچھلی کو کرنا ہوتا ہے۔



• بلا تبصرہ

ہم تو سمجھتے تھے کہ ادب میں انتخاب کرنا سب سے آسان ہے کہ جس کا ادب کرنے کو دل چاہا' اسے انتخاب میں شامل کر لیا۔ اگر تحریروں کا انتخاب بھی کرنا پڑے تو کیا مشکل ہے؟ ایک بار ایک نوجوان فیض احمد فیض صاحب کے پاس اپنی تین نظمیں لے کر گیا کہ مجھے ریڈیو پر ایک نظم پڑھنا ہے' ان تینوں میں سے ایک کا انتخاب کر دیں۔ فیض صاحب نے دو نظمیں سنیں تو کہہ دیا "تیسری پڑھ لینا۔" ایسے ہی علی اکبر عباسی صاحب نے اپنی کتاب "درنگاہ" میں غزلوں اور نظموں کا انتخاب امجد طفیل کی سربراہی میں ایک پانچ رکنی کمیٹی کے سپرد کیا اور جو غزلیں' نظمیں کمیٹی کی سمجھ میں آ گئیں' وہ رکھ لیں اور باقی کو کتاب میں شامل کر لیا۔ اسی مقصد کے لیے اکادمی ادبیات نے 1990ء کے پاکستانی ادب کے نثری انتخاب کے لیے تین رکنی مجلس مشاورت بنائی اور مرتب کے طور پر رشید احمد صاحب کی "طویل" خدمات حاصل کیں۔ انتخاب کا لفظ ایسا ہے کہ اس کے ساتھ لفظ ادبی جچتا ہی نہیں' اس کے ساتھ دھاندلی ہی جچتا ہے۔ جس انتخاب پر دھاندلی کا الزام نہ لگے' لگتا ہے وہ انتخاب ہوا ہی نہیں لیکن اکادمی ادبیات نے اس انتخاب میں ایسے اختلاف کی گنجائش کم کرنے کے لیے اس کی قیمت زیادہ سے زیادہ رکھی ہے تاکہ لوگوں کو اختلاف مہنگا پڑے۔ ویسے بھی ادبی کتاب کی جس قدر قیمت زیادہ ہو گی' ادب کی اتنی قدر و قیمت بڑھے گی۔

ہمارے ایک دوست نے کہا "آپ اس ادبی انتخاب پر تبصرہ لکھیں۔" ہم نے کہا "مگر ہمیں تو ادب کی سمجھ نہیں۔" کہا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں' تبصرہ لکھ دو۔" ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ تبصرہ طویل نہ ہو۔ کسی کتاب پر طویل تبصرہ نہ لکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ آپ کتاب کو پڑھ لیں۔ لیکن سڈنی سمتھ نے کہا ہے کہ کسی

کتاب پر تبصرہ لکھنے سے پہلے بندے کو وہ کتاب نہیں پڑھنا چاہیے کیونکہ اس طرح بندہ غیر جانبدار نہیں رہتا۔ ویسے بھی ہم سے اگر تبصرہ کروانا ہی تھا تو شاعری کے انتخاب پر بنتا تھا ویسے بھی اردو شاعری پر ہمارا یہ احسان ہمیشہ رہے گا کہ ہم نے تمام مواقع ملنے کے باوجود شاعری نہیں' نثر کو ہی نثار کیا۔ برنارڈشا کو ایک نوجوان نے دعوت دی کہ آپ میرا ڈرامہ دیکھ کر اپنی رائے دیں۔ ڈرامے کے دوران برنارڈشا سو گئے تو اس نے ہلا کر کہا "آپ تو سو رہے ہیں' آپ کو تو میں نے تبصرے کے لیے کہا تھا۔" تو برنارڈشا نے کہا "یہ تبصرہ ہی تو ہے۔" سو اس حساب سے تو ہم انتخاب پر تبصرہ کر چکے ہیں کہ جب سے یہ ہمارے ہاتھ لگا ہے' رات کو اس کے بغیر نیند نہیں آتی۔ ہمیں اس کے انتخاب میں جو چیز سب سے اچھی لگی' وہ یہ ہے کہ 1990ء میں چھپنے والی کسی ادبی کتاب سے کوئی کہانی' مضمون' افسانہ اور انشائیہ نہیں لیا گیا کیونکہ جس کی تحریر کوئی رسالہ یا اخبار نہیں چھاپتا' وہ اٹھ کے کتاب چھاپ لیتا ہے۔ ویسے بھی سڈنی سمتھ نے ٹھیک کہا ہے کہ کتابیں تو گھر کے فرنیچر کا حصہ ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں کتابیں پڑھنے سے زندگی میں ترتیب آ جاتی ہے' حالانکہ ان میں خود ترتیب نہیں ہوتی۔ کتابوں میں ڈکشنری واحد کتاب ہے جس میں الفاظ ترتیب سے ہوتے ہیں' باقی کتابیں انہی لفظوں کو بے ترتیب کرنے سے ترتیب پاتی ہیں۔ پہلے لوگ بوریت سے بچنے کے لیے کتابیں پڑھتے تھے' اب لوگ اسی مقصد کے حصول کے لیے نہیں پڑھتے۔ مغربی ممالک میں کتابیں لکھنے سے رائٹر کے حالات بہتر ہوتے ہیں' یہاں بھی بہتری ہوتی ہے جیسے رضیہ بٹ' سلمیٰ کنول' بشریٰ رحمٰن' اے حمید اور مستنصر حسین تارڑ نے اتنا لکھا ہے کہ سب کی ہینڈ رائٹنگ بہتر ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس کے انتخاب میں یہ خوبی ہے کہ اسے جلدی میں کیا گیا ہے' سو زیادہ غلطیاں کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ سنا ہے دو مہینوں میں یہ سب ہوا۔ واقعی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ میں تو دو ماہ تو لگ

ہی جاتے ہیں۔ آپ تبصرے کو بلا تبصرہ سمجھیں کیونکہ ہم نے جو لکھا' بڑے نقادوں کی طرح لکھا ہے یعنی بغیر سوچے سمجھے کیونکہ ڈان مارکیوٹس کے بقول "جب بندہ لکھ رہا ہو تو سوچ نہیں رہا ہوتا کیونکہ ایک وقت میں تو بندہ ایک ہی کام کر سکتا ہے۔"

○○○

- بلھڑ یونیورسٹی

پچھلے دنوں پولیس نے ایک ایسی یونیورسٹی کو گرفتار کیا جو ملک سے چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جہالت کم کر رہی تھی۔ دنیا کی یہ مختصر ترین یونیورسٹی اقبال عرف بلھڑ کی کار کی پچھلی سیٹ پر قائم تھی۔ ہر قسم کی مہریں' اسناد' سرٹیفکیٹ اور دوسری چیزیں موجود تھیں۔ یہ یونیورسٹی ہر وقت چلتی رہتی لیکن کار چونکہ پرانی تھی اور بیوی اور کار جب پرانی ہو جائے تو چالیس سے اوپر نہیں جاتی' سو وہ اسی رفتار سے اسناد تقسیم کرتی۔ کہتے ہیں کہ اقبال عرف بلھڑ یونیورسٹی کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی۔ ممکن ہے وہ ایکسٹرا یونیورسٹی ہو یا الگ خواتین کی یونیورسٹی ہو لیکن دونوں اس قدر پاس پاس تھے کہ آپ انہیں بلھڑ مخلوط یونیورسٹی کہہ سکتے ہیں۔ پہلے اقبال' اوپن یہ کام کرتا تھا تو اقبال اوپن یونیورسٹی کہلاتا تھا لیکن اب اس نے بلھڑ یونیورسٹی بنا لی۔ یہ ایشیا کی واحد یونیورسٹی تھی جس کا نتیجہ ہمیشہ سو فیصد ہوتا۔ جب سے حکومت نے تعلیم کو سستا کرنے کا منصوبہ بنایا' بلھڑ یونیورسٹی نے بھی رعایتی نرخوں پر ڈگریاں دینا شروع کر دی تھیں۔

حکومت کو چاہیے تو یہ تھا کہ اس نجی یونیورسٹی کی حوصلہ افزائی کرتی لیکن اس نے اسے بذریعہ پولیس سرکاری تحویل میں لے لیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ ہمارے ہاں یہی ہوتا آیا ہے۔ سکندر مرزا کے زمانے میں کابینہ تشکیل ہوئی' سارے وزیر اپنے محکموں کا چارج لینے سیکرٹریٹ کی طرف بھاگے۔ قدرت اللہ شہاب نے جب فہرست چیک کی تو معلوم ہوا کہ تعلیم کا شعبہ الاٹ ہونے سے رہ گیا ہے۔ وہ یہ سکندر مرزا کے نوٹس میں لائے تو انہوں نے حکم دیا "جاؤ جو وزیر ملتا ہے' اسے لے آؤ تاکہ اسے تعلیم کا اضافی چارج دے دیا جائے۔" شہاب صاحب دوڑے دوڑے گئے' دیکھا مشرقی پاکستان کے ایک بزرگ وزیر جنہیں دمے کی وجہ سے کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا' ابھی کار میں سوار ہونے کی

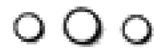
کوشش کر رہے تھے۔ انہیں واپس لا کر تعلیم کا شعبہ الاٹ کروا دیا گیا۔ تب سے شعبہ تعلیم کھانس رہا ہے۔ غلام حیدر وائیں صاحب کو بھی کھانسی یہیں سے لگی۔ اب ایسے وزیر تعلیم بھی ہیں کہ کسی نے کہا "آپ ماڈل وزیر بن سکتے ہیں؟" بولے "کیسے؟ مجھے تو "پوز" بنانا نہیں آیا' ماڈلنگ کیسے کروں گا؟"

کہتے ہیں جب کسی کالج کی انتظامیہ اس میں دلچسپی لینا بند کر دے تو وہ یونیورسٹی کہلاتا ہے۔ ویسے بھی کالج اور یونیورسٹیاں تو اس لیے بنائی گئی ہیں کہ لوگوں کو جہالت کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ امریکی صدر روز ویلٹ تو یہاں تک کہتا ہے کہ اگر کوئی بندہ کبھی سکول نہیں گیا تو وہ زیادہ سے زیادہ مال گاڑی کی بوگی ہی چرا سکتا ہے لیکن جو یونیورسٹی گیا ہو' وہ تو پوری ریل کی پٹڑی چرا لے گا۔ اسی لیے ہمارے طلبہ یونیورسٹی میں دل لگا کر پڑھنے کے لیے' دل لگانے میں لگے رہتے ہیں تاکہ پھر پڑھ سکیں۔ آخر میں تعلیمی اخراجات کی رسیدوں کے طور پر انہیں ڈگریاں اور سندیں دے دی جاتی ہیں۔ یوں ہمارے ہاں بیروزگار بننے کے لیے بندے کو یونیورسٹی میں کئی کئی سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہی کام بلھڑ یونیورسٹی نے منٹوں میں کرنا شروع کر دیا تھا۔

اقبال عرف بلھڑ خود تو ایسا طالب علم تھا ہی کہ جب سکول میں ماسٹر سوال پوچھتا تو بلھڑ فوراً اپنا ہاتھ کھڑا کر دیتا اور جب تک وہ "فارغ" ہو کر آتا' سوال کا جواب دیا جا چکا ہوتا۔ لیکن اس نے ایسی یونیورسٹی بنا دی جو اسناد کی ڈلیوری کے لیے چوبیس گھنٹے کھلی رہتی جس سے لوگوں میں علم کی افادیت کا اس قدر شعور ہوا کہ بلھڑ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کرنے والے ایک صاحب نے کہا "اس سے مجھے اس قدر افاقہ ہوا ہے کہ میں نے سوچا ہے' اب میٹرک بھی کر ہی لوں۔" بلھڑ صاحب اس یونیورسٹی کے طلبہ کو وہ موقع بھی دینے والے تھے جو بلھڑ صاحب کے باپ کو بھی نہ مل سکا تھا یعنی مرد بھی گورنمنٹ کالج برائے خواتین اور کنئیرڈ کالج سے ایف اے اور بی اے کر سکتے۔

مرحومین کی تعلیم کا تو بلھڑ یونیورسٹی میں پہلے ہی انتظام تھا۔ بڑے بڑے افسر اپنے مرحوم

باپوں کو پچھلی تاریخوں میں ایم اے اور ایم ایس سی کروا سکتے تھے۔ اب تو یہ امید ہو چلی تھی کہ ڈگریوں کی کلیرنس سیل پر پانچ ڈگریاں اکٹھی خریدنے والے کو جرنلزم کی ڈگری مفت ملا کرے گی۔ یہ ایسی نایاب یونیورسٹی تھی کہ یہاں آپ کا بچہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ایم اے کر سکتا۔ یوں دنیا میں پہلی بار تعلیم یافتہ بچے پیدا ہوتے جو ورلڈ ریکارڈ ہوتا لیکن ہم اپنے ٹیلینٹ کی قدر نہیں کرتے۔ بلھڑ یونیورسٹی کو حوالہ پولیس کر دیا گیا ہے۔ ویسے ہو سکتا ہے اسے پولیس کے حوالے اس لیے کیا گیا ہو کہ ہمارے ہاں جب تک یونیورسٹی کیمپس میں پولیس نظر نہ آئے' یونیورسٹی نامکمل سی لگتی ہے۔



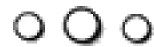
• شادی کا نصاب

ہم تو انگریزی کو بحیثیت مضمون مڈل' میٹرک اور ایف اے کے نصاب میں شامل کرنے کے حق میں نہ تھے۔ اب اسے شادی کے نصاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ وہ ہتھ چھٹ جو کئی کئی "پرچوں" پر نہ گھبراتے تھے' شادی پر انگریزی کے پرچے سے سہمے نظر آنے لگے ہیں۔ ہوا یہ کہ شرقپور شریف کے حاجی عبداللہ نے اپنی بیٹی کی شادی کے موقع پر عین نکاح سے پہلے شاہ کوٹ سے آنے والی بارات کے دولہا محمد جمیل سے کہا "انگریزی بول کر سناؤ۔" اسے ٹینس کرنے کے لیے ٹینس بھی سنے گئے جس سے پتہ چلا کہ ان کی بی اے لڑکی کا ہونے والا خاوند تو ابھی اے بی پر ہی ہے۔ سو انگریزی کے پرچے میں ناکامی پر محمد جمیل کو بارات سمیت ناکام لوٹا دیا گیا۔ ہو سکتا ہے محمد جمیل سپلیمنٹری امتحان کی تیاری میں جیت بھی گیا ہو۔

انگریزی ہم پاکستانیوں کو اتنی اچھی لگتی ہے کہ ہم اسے انگریز کی مونث ہی سمجھتے ہیں۔ ہم بھی انگریزی پڑھ لیتے ہیں بشرطیکہ وہ اردو میں لکھی ہو۔ انگریز اس وقت بولتے ہیں جب ان کے پاس کہنے کو کچھ ہو اور ہم اس وقت چپ ہوتے ہیں' جب ہمارے پاس کہنے کو کچھ ہو۔ ہم تو ہمیشہ انگریزی میں چپ ہوتے ہیں۔ میکس بیرہوم وہیکل کے بقول "جذباتی شاعری کی نقل و حمل کے لیے انگریزی بہترین وہیکل ہے۔" ویسے اس لحاظ سے تو اردو بھی کم نہیں کہ نقل اور حمل اس میں بھی بہت ہوتا ہے لیکن ہم انگریزی کی اس قدر نقل کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو تعلیمی اداروں میں سب سے زیادہ نقل انگریزی میں ہی ہوتی ہے۔ تاہم ہمیں یہ پتہ نہ تھا کہ اب اس کے بغیر شادی بھی نہ ہو سکے گی۔ سب سے پہلے تو ہمیں اس بات پر اعتراض ہے کہ خاوند سے بولنے کا امتحان کیوں لیا گیا؟ کیونکہ شادی کے بعد خاوند نے کونسا بولنا ہوتا ہے۔ اگر ٹیسٹ ہونا بھی تھا تو سننے کا ہونا چاہیے تھا۔ جدید ترین ریسرچ کے مطابق خاوند کی قوت سماعت

بیویوں سے کم ہوتی ہے جس کی وجہ ماہرین یہ بتاتے ہیں کہ مسلسل شور اور بلند آوازیں سن کر ان کی قوت سماعت کمزور ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی اگر سننے کا مقابلہ ہو تو محمد جمیل صاحب انگریزی بڑی روانی سے سن سکتے ہیں بلکہ سن کر "سن" ہو جاتے ہیں البتہ ہمیں تو شادی اور انگریزی میں یہی قدر مشترک نظر آتی ہے کہ دونوں کی سمجھ بار بار دہرانے سے ہی آتی ہے۔ دولہے کے لیے انگریزی جاننا شاید اس لیے ضروری سمجھا گیا ہو کہ اس کی کم از کم تین زبانیں تو ہوں تاکہ وہ لڑکی کے ساتھ گزارا کر سکے۔ لڑکی کے لیے انگریزی یا دوسری زبان جاننا اس لیے ضروری نہیں کہ عورت کے لیے ایک زبان ہی کافی ہوتی ہے۔ پھر انگریزی وہ زبان ہے کہ اس میں گالی بھی دی جائے تو پتہ نہیں چلتا' تعریف کی ہے یا برا بھلا کہا ہے۔ مغرب میں کتا اور کتیا معاشرے کے معزز رکن ہیں۔ کسی کو انگریزی میں کتا یا کتیا کہنے سے اگر کسی کی عزت کم ہوتی ہے تو وہ یقیناً کتا اور کتیا کی ہو سکتی ہے۔ ویسے بھی ہمارے ہاں انگریزی اس قدر استعمال ہوتی ہے کہ پتہ نہیں چلتا' یہ انگریزی ہے بھی یا نہیں۔ ہماری رائے میں تو مبینہ خاوند سے امور خانہ داری کا امتحان لیا جانا چاہیے۔ نکاح سے پہلے اس سے مٹر گوشت پکوا کر چکھا جاتے تو بات بنتی تھی۔ ایک انگریز مفکر خاتون کہتی ہے "مجھے خانہ داری سے چڑ ہے۔ آپ بستر بچھاتے ہیں' برتن دھوتے ہیں اور چھ ماہ بعد پھر سے بستر بچھانے والے اور برتن دھونے والے ہو چکے ہیں۔ سو میرا تو خاوند کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا۔" یہ بھی کسی خاتون ہی کا قول ہے کہ میں نے برتن صاف کرنے کے لیے ساری چیزیں استعمال کر کے دیکھ لیں مگر خاوند سے بہتر کسی کو نہیں پایا۔ سو زبان کے امتحان کی بجائے امور خانہ داری کا امتحان ہونا چاہیے کیونکہ ماہرین کہتے ہیں کہ خاوند اگر انگریزی کا صرف ایک حرف سیکھ لے تو انگریزی بولنے والی بیوی کے ساتھ عمر بھر خوش و خرم رہ سکتا ہے اور وہ لفظ ہے "یس" (Yes) ہم تحریری امتحان کے بھی خلاف نہیں کیونکہ بندہ چند سالوں کے لیے کہیں ملازم ہوتا ہے تو اس کا تحریری امتحان اور زبانی ٹیسٹ ہوتا ہے۔ پبلک سروس کمیشن پاس کرنا ہوتا ہے۔ یہاں تو ساری عمر کا

معاملہ ہے۔ پھر فائدہ ہو گا کہ خواندگی اور خاوندگی ساتھ ساتھ بڑھے گی۔ ویسے تو یہ حال ہے کہ بقول ابن انشاء "کراچی میں اساتذہ کی بستی میں بھی خواندگی کی شرح 70 فیصد ہے۔" دور کیا جانا لاہور میں صرف 50 فیصد پروفیسر پڑھے لکھے ہیں' اکثر پری فیسر ہی ہیں۔ یاد رہے یہاں پری فیسر سے مراد خاتون پروفیسر نہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو شادی خود ایک امتحان ہے جس کے نتائج پر کنٹرول کے لیے محکمہ منصوبہ بندی رات دن کام کر رہا ہے۔



• مولانا بجلی گھر

اتنا تو ہمیں پتہ تھا کہ مولانا بجلی گھر اکثر عورتوں سے بھرے بیٹھے ہوتے ہیں لیکن یہ انکشاف ان کی کل کی تقریر سے ہوا کہ اسمبلیاں بھی عورتوں سے بھری ہوئی ہیں۔

سچی بات ہے مولانا صاحب بجلی کے بیان کے بعد پہلی بار اسمبلی نظر آئی ہے' پہلے تو اسمبلی نظر آتا تھا۔ مولانا امیر بجلی گھر خود ایسی شخصیت ہیں کہ کسی نے بتایا یہ مولانا بجلی گھر ہیں تو دیکھنے والے نے کہا "یہ سارے!" پھر وہ واحد بجلی گھر جو پشاور میں یوں پھرتا ہے جیسے کسی کے دن پھرتے ہیں۔ وہ جس کمرے میں بیٹھ جائیں' وہ ان سے لبالب بھر جاتا ہے۔ سو ہو سکتا ہے انہوں نے کسی خاص شخصیت کے حوالے سے اسمبلیوں کے بھر آنے کا تذکرہ کیا ہو۔ اس حساب سے تو یہ انکشاف کئی برس پرانا ہے کہ اب بیگم عابدہ حسین اور شاہین عتیق الرحمٰن جیسی "بڑی" خواتین اسمبلی میں نہیں ہیں۔ ان دنوں اسمبلی میں خواتین بہت نظر آتیں بلکہ بندہ صرف بیگم صاحبہ کو ہی دیکھتا تو وہ ہی بہت نظر آتیں۔ صاحب بندہ 6 ماہ بوائز ہوسٹل میں رہے تو اسے ہر خاتون خوبصورت نظر آنے لگتی ہے۔ اگر ایک سال رہ جائے تو ہر خوبصورت چیز عورت نظر آنے لگتی ہے۔ پشاور کے بازاروں میں تو بندہ پھر رہا ہو تو لگتا ہے برسوں سے بوائز ہوسٹل میں گھوم رہا ہے' وہاں بھی اتنا ہی اسلحہ نظر آتا ہے۔ وہاں تو عورت کو کھلے منہ دیکھ کر مردوں کے سر کھل جاتے ہیں۔ سو ہو سکتا ہے مولانا بجلی گھر نے اسمبلی میں کسی خاتون کو کھلے منہ دیکھ کر اسے پوری اسمبلی سمجھ کر یہ بیان دے دیا ہو۔

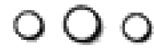
ہم بولنے سے پہلے دو بار سوچتے ہیں اور دو بار سوچنے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ہم کو بولنا نہیں پڑتا لیکن مولانا تو خاموش بھی بلند آواز میں ہوتے ہیں۔ اگر مولانا بجلی گھر آپ کے پاس خاموش بیٹھے ہوئے ہوں تو یقین کر لیں' آپ مولانا بجلی گھر کے پاس نہیں

بیٹھے ہوئے۔ وہ جو بولتے ہیں' اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ اس لیے وہ لطیفہ سنا رہے ہوں تو لوگ یوں ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جیسے لطیفہ سن نہیں رہے' دیکھ رہے ہوں۔ صوبہ سرحد میں جتنی کیسٹیں ان کی بکتی ہیں' اتنی تو مہ جبیں قزلباش کی نہیں بکتیں۔ ہم نے کسی سے پوچھا "سنا ہے مولانا بجلی گھر کی تقریروں کی کیسٹیں بلیک ہوتی ہیں۔" تو وہ بولا "نہیں بڑی رنگین ہوتی ہیں۔" سو ہمیں لگتا ہے کہ یہاں ان کا اشارہ اسمبلی کی رکن خواتین کی طرف نہیں' ویسے بھی وہ اس عمر میں بھلا کیوں عورتوں کو اشارے کرنے لگے۔ مرد آدمی ہیں' انہیں تو عورتوں کی بھی جو خوبی پسند ہے' وہ عورتوں کی مردانگی ہی ہے۔ سو ہو سکتا ہے انہوں نے اسمبلی کی کارروائی پڑھ لی ہو جس سے انہیں اسمبلی کی جنس پر شک ہوا ہو۔

مولانا بجلی گھر کا وجود لوڈ شیڈنگ کے اس دور میں غنیمت ہے۔ صوبہ سرحد میں کالا باغ ڈیم کے بعد وہ دوسرے بڑے متنازعہ بجلی گھر ہیں۔ ہمیشہ سے عورتوں کے مخالف رہے ہیں' جی ہاں! صنف مخالف رہے ہیں۔ عورتوں کی مخالفت کی وجہ شاید یہ مماثلت ہو کہ خواتین بھی بجلیاں گراتی ہیں لیکن مولانا کی گفتگو ایسی ہوتی ہے کہ بجلی نہیں' پورا بجلی گھر گر پڑتا ہے۔ ان کے مخالفین تو اپنے گھروں میں "بجلی کے جھٹکوں کی طبی امداد" کے کتابچے ضرور رکھتے ہیں۔ اس بجلی گھر کی وجہ سے صوبہ سرحد میں بڑا ایندھن بچتا ہے۔ بندہ سخت سردی میں صرف ان کی کیسٹ سن کر رات گزار سکتا ہے۔ ویسے بھی دوسری بجلی تو ہمارے ہاں صرف لوڈ شیڈنگ کے کام آتی ہے لیکن اب مولانا بجلی گھر بھی لوڈ شیڈنگ پر اتر آئے ہیں۔ ان کی بے تحاشا کارکردگی کی وجہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کے واحد بجلی گھر ہیں جو واپڈا کے کنٹرول میں نہیں۔ یہ بجلی گھر ہمیشہ کرنٹ موضوعات سے بھرا ہوتا ہے۔ پھر عورتوں سے زیادہ کرنٹ والا موضوع کونسا ہو گا۔

مولانا بجلی گھر کسی جلسے سے جلدی چلے جائیں تو جلسے کی وہی حالت ہوتی ہے جو بجلی کے جانے سے ہوتی ہے۔ سو وہ اکثر ایسے کرنٹ موضوعات سے جلسوں کو چارج کرتے

رہتے ہیں۔ جیسے ایک ڈاکٹر نے مریض سے کہا "آپ کی زندگی بس چھ ماہ ہے۔" تو اس نے کہا "یہ مختصر زندگی کس طرح طویل ہو سکتی ہے؟" ڈاکٹر نے کہا "کسی سیاستدان خاتون یا اداکارہ سے شادی کر لیں۔" اس نے پوچھا "کیا مطلب؟ اس سے کیسے میرے میری عمر لمبی ہو جائے گی؟" تو ڈاکٹر نے کہا "عمر تو لمبی نہیں ہو گی البتہ چھ ماہ ضرور لمبے ہو جائیں گے۔" سو ہو سکتا ہے انہوں نے تقریر کو طول دینے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا ہو یا ہو سکتا ہے انہوں نے ساتھ انشاء اللہ بھی کہا ہو۔ ہم جب دسویں جماعت میں تھے تو فون آیا' کوئی پوچھ رہا تھا "یہ ڈاکٹر صاحب کا گھر ہے؟" تو ہم نے کہا "انشاء اللہ! آپ آٹھ دس سال بعد فون کریں۔" سو ممکن ہے انہوں نے یہ کہہ کر اس پیش گوئی کی طرف اشارہ کیا ہو جس کے مطابق 2000ء میں عورت راج کرے گی۔



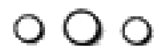
- **عمرانیات**

ہماری کسی اداکارہ سے پوچھو کہ آپ کو کھیلوں میں کیا پسند ہے؟ تو کہے گی ''کرکٹر'' اکثر تو خود ایسی کھلاڑی نکلیں کہ بڑے بڑے فاسٹ باؤلر کیچ کر لیے۔ کچھ اداکاراؤں نے اپنی ''زینت'' کو عمران خان کی ''امان'' میں بھی دینا چاہا مگر آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ عمران خان کو کون پسند ہے؟ لیکن گزشتہ دنوں انہوں نے انکشاف کر ہی دیا کہ مجھے ''قوالی'' پسند ہے۔ پہلے تو ہم سمجھے محترمہ ''قوالی'' کوئی بھارتی اداکارہ ہیں مگر انہوں نے ہم جیسوں کے لیے واضح کر دیا کہ ''مجھے نصرت فتح علی خان کی قوالی پسند ہے۔'' صاحب! نصرت فتح علی خان کے نام میں دو بار فتح ہے۔ گویا وہ دوہرے فتح علی خان ہوئے' دیکھنے سے اس کا یقین بھی ہو جاتا ہے۔ وہ تو گا رہے ہوں تو لگتا ہے فتح کر رہے ہیں' عمران خان کو فتح بہت اچھی لگتی ہے۔ پھر ڈبل فتح علی خان خیر سے خان بھی ہیں۔ سو انہیں پسند کرنے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے مگر قوالی کی سمجھ نہیں آتی۔ جب ہم بچے تھے تو ہمارے گاؤں میں ایک قوال مہینے میں ایک بار خوش ہو کر سب کو قوالی سناتے البتہ ناراض ہوتے تو مہینے میں کئی بار سناتے۔ ہمیں بھی قوالی اچھی لگتی' خاص کر کے اس وقت جب یہ ختم ہوتی۔ قوالی میں بہت سے گانے والے مل کر یوں گاتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا' سب سے اچھا کون گا رہا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ بڑی خود کفیل موسیقی ہے۔ اس میں اتنے گانے والے ہوتے ہیں کہ سامعین نہ بھی ہوں تب بھی ہال بھر سکتا ہے۔ پھر گانے والے اپنے لیے خود تالیاں بھی بجاتے ہیں۔ کرکٹرز کو تالیاں سننے کی اس قدر عادت پڑی ہوتی ہے کہ ان کو تو صبح اٹھانے کے لیے بھی تالیاں بجانا پڑتی ہیں۔ مشتاق یوسفی صاحب کے خیال میں ''فی زمانہ قوالی کا اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو' ملیریا کے خاتمے میں قوالی کا اہم رول ہے۔ آج کل اتنے مچھر ڈی ڈی ٹی سے نہیں مرتے جتنے قوالوں کی تالیوں سے مرتے

ہیں۔" عمران خان آج کل ہسپتال بنانے کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر بلکہ بڑھ کر کم چڑھ کر زیادہ حصہ لے رہے ہیں۔ ہم نے بھی عمران خان کو آفر کی ہے کہ ان کے ہسپتال کی سب سے اہم ضرورت ہم پوری کریں گے جس کے بغیر ہسپتال ایک دن بھی نہیں چل سکتا یعنی مریض ہم بھیج دیا کریں گے۔ سو ہو سکتا ہے انہیں اسی لیے قوالی اچھی لگتی ہو کہ یہ صحت مندی کو فروغ دیتی ہے۔ فاتح موسیقی ڈبل فتح علی خان کی خود ایسی صحت ہے کہ انہیں ہجے کر کے دیکھنا پڑتا ہے۔ اتنے بڑے ہیں کہ ایک بار ان کے پیٹ پر چوٹ لگ گئی تو زخم ڈھونڈنے میں 12 گھنٹے لگے۔ گلوکاری لفظوں کا رقص ہے لیکن وہ گا رہے ہوں تو لگتا ہے لفظوں کی کشتی ہو رہی ہے۔ اگر کوئی ہم سے پوچھے' آپ کو پاکستان کی پارٹیوں میں سب سے اچھی کون سی لگتی ہے تو ہم قوال پارٹی چنیں گے۔ یہ واحد پارٹی ہے جو سڑکوں اور بازاروں میں مظاہرے کر کے لوگوں کو تنگ نہیں کرتی' مزاروں پر کرتی ہے اور یہاں "گزرنے" والوں نے کبھی اس پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ دوسری پارٹیوں کی طرح ان کا سربراہ بھی جو کہتا ہے' باقی اس کی تانیں لگاتے ہیں اور تالیاں بجاتے ہیں۔ اگرچہ ہمیں نوابزادہ نصراللہ خان کی مشہور قوالی "کرسی ورسی چھوڑ شتابی کرسی ورسی چھوڑ دے۔" بھی اچھی لگتی ہے۔ خان عبدالولی خان کی پرانی قوالی "بم مارو بم" بھی سنتے رہے ہیں۔ پیپلز پارٹی نے قوالی کو بڑا عروج دیا۔ ان میں بڑے مشہور قوال گزرے ہیں "آدمی ہے بے نظیر" کے بعد اب وہ بہنوں کے لیے "میرا پیا گھر آیا میں شکر ونڈاں" کی دھنیں ترتیب دے رہے ہیں۔ وزیر بھل صفائی غلام حیدر وائیں کی قوالی "میں ہوں دیوانی میرٹ کی" کا ریکارڈ آج کل بڑا لگایا جا رہا ہے لیکن عمران خان کو ڈبل فتح علی خان کی قوالی سب سے اچھی لگتی ہے۔

وہ کہتے ہیں "اس کا مطلب ہے عمران خان پچاس برس کے ہو گئے۔" ہم نے کہا "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" کہا "میرے دادا کو نصرت فتح علی خان کے ساتھ ساتھ غلام فرید صابری بھی پسند ہے اور میرے دادا 100 سال کے ہیں۔" ویسے بھی عمران خان کی اب

وہ عمر ہے کہ پچھلے دنوں پنجاب یونیورسٹی کی ایک تقریب میں لڑکیوں نے "وی وانٹ بھابھی" کا شور مچایا تو انتظامیہ نے کہا غلط نعرے نہ لگائیں تو لڑکیوں نے درستی کی "وی وانٹ چاچی۔" پھر قوالی تو وہ گانا ہے جسے گانے والے بھی بار بار اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ یوں توبہ کی عمر آتے ہی لوگ قوالی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ سو ہو سکتا ہے کہ ہمارے کرکٹر قوالی کو موسیقی سمجھ کر نہیں، صرف اللہ اللہ کرنے کے لیے سنتے ہوں۔ پچھلے دنوں جب برطانیہ میں نصرت فتح علی خان صاحب نے قوالی کا مظاہرہ کیا، انگریز تک اللہ اللہ کرنے لگے۔ جونہی نصرت فتح علی خان مصرع اٹھاتے انگریز باآواز بلند کہتے "اومائی گاڈ" ہمیں تو لگتا ہے روز قیامت میں انہیں اس لیے جنت ملے گی کہ انہوں نے بڑے بڑے مولویوں سے زیادہ لوگوں کو اللہ کی یاد دلائی۔ ہم جیسے بھی ان کی قوالی خدا خدا کر کے سنتے ہیں۔



• کھر۔ مستیاں

پہلے تو بڑے بوڑھے چھوٹوں کی حرکتوں سے اندازہ لگاتے تھے کہ یہ کھر مستیوں پر اتر آیا ہے۔ مگر اب تو جو باقاعدگی سے اسمبلی کی کارروائی پڑھنے لگے' اسے شک سے دیکھنے لگتے ہیں اور چپکے چپکے اس کی شادی کا انتظام کرنے لگتے ہیں۔ ہمیں اخباروں میں سکینڈلز ہی اچھے لگتے ہیں یعنی ہم اسمبلی کی کارروائی باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ کل کی کارروائی پڑھ کر پتہ چلا امجد حمید دستی صاحب ناخوش ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں دو سو بھارتی دوشیزائیں خاموشی سے داخل ہو چکی ہیں۔ پہلے تو ہمیں پہلی بات کا یقین نہ آیا یعنی دستی صاحب کے ناخوش ہونے کا۔ امجد حمید دستی صاحب حسینوں کے آنے پر ناخوش نہیں ہو سکتے اور اگر وہ ناخوش ہیں تو وہ امجد دستی نہیں ہو سکتے۔ ان کے تو کان بند ہوں تب بھی وہ زنانہ آواز سن لیتے ہیں کیونکہ وہ پورے جسم سے سنتے ہیں۔ ستر سال سے زائد عمر کے ہوں گے مگر ستر سال کو یوں ڈھانپتے ہیں جیسے ستر ڈھانپ رہے ہوں۔ اپنے سر پر آج بھی بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔ جانتے ہیں ہر بڑے آدمی کے پیچھے ایک عورت ہوتی ہے۔ اسی لیے اسمبلی میں وہاں بیٹھتے ہیں جہاں ان کے پیچھے کوئی عورت ضرور ہو۔ سو یا تو خبر کا متن درست نہیں یا دستی تندرست نہیں۔ ہمیں تو خبر کا یہ حصہ بھی درست نہیں لگتا جس کے مطابق دو سو دوشیزائیں خاموشی سے پاکستان میں داخل ہو چکی ہیں۔ دو سو عورتیں اکٹھی ہوں اور وہ خاموشی سے داخل ہو جائیں بلکہ اتنی عورتیں پانچ منٹ سے زیادہ خاموش رہیں تو انہیں ہسپتال میں داخل کرانا چاہیے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے داخل ہوتے وقت وہ ایک دوسرے کو خاموش کر رہی ہوں۔ ایک ایسی ہی جاسوس خاتون کو دوسرے ملک بھیجنے سے پہلے پوچھا گیا کہ آپ کتنی دیر تک چپ رہ سکتی ہیں تو اس نے کہا' سات منٹ سانس روکنے کی مجھے پریکٹس ہے۔ اگرچہ خفیہ مشن پر عورتوں کو بھیجنے کے لیے یہی احتیاط کرنا چاہیے کہ مشن کو ان سے خفیہ

رکھا جائے' پھر بھی دو سو دوشیزاؤں کو بھیجنا ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسے جو بات ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ دوست اسے سمجھداری کی بات سمجھنے لگتے ہیں۔ بہرحال اس سے ہمیں "را" بھی "ری" لگنے لگی ہے۔ اگرچہ آج کل عورتیں مردوں سے ہر کام میں آگے ہیں۔ ہم نے ہر جگہ مردوں کو ہی ان کے پیچھے دیکھا۔ سو ممکن ہے اس لیے عورتوں کو بھیجا گیا ہوتا کہ وہ پاکستان لیڈروں کو اپنے پیچھے لگا سکیں۔ ہمیں اکثر باتوں کی کم ہی سمجھ آتی ہے۔ جیسے گزشتہ کئی ماہ سے سینٹ کے چیئرمین وسیم سجاد ذہنی معذوروں کی تقریبات کے مہمان خصوصی چلے آ رہے ہیں۔ چند دن قبل پھر ذہنی معذوروں کے ایک ادارے نے انہیں اسی حیثیت سے بلایا تو ہم نے پوچھا "آخر انہیں ہی کیوں ایسی تقریبات میں بلایا جاتا ہے؟" تو کسی نے کہا "اس لیے کہ وسیم صاحب بھی ایک ایسا ادارہ چلا رہے ہیں۔" بہرحال کافر حسیناؤں کا آنا معمولی بات نہیں' ہم اتنے بھی ناشکرے نہیں کہ بھارت کا اس پر شکریہ ادا نہ کریں۔ ہمیں تو اپنے ہاں کوئی بہت خوبصورت لڑکی نظر آئے جس کی تعریف لفظوں میں نہ ہو سکے تو ہم اسے کافر حسینہ کہتے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے یہ مصطفیٰ کھر کو گرفتار کرنے کے لیے آئی ہوں گی۔ سنا ہے یہ دوشیزائیں حسن کے ہر قسم کے جدید اسلحے سے لیس ہیں۔ اخبار والوں نے ان کی واحد نشانی یہی بتائی ہے کہ وہ بہت خوبصورت ہیں۔ کھر صاحب نے آج تک پاکستان میں بھی کوئی بدصورت خاتون نہیں دیکھی۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جو بدصورت ہو' اسے دیکھتے ہی نہیں۔ بہرحال ان خوبصورت دوشیزاؤں پر نظر رکھنا تو ان کے قومی فرائض میں شامل ہے۔

کہتے ہیں ایک عورت ویران جنگل سے اکیلی گزر رہی تھی۔ اس کے راستے میں سانپ آیا' حوصلہ کر کے گزر گئی۔ پھر راستے میں بھیڑیا نظر آیا مگر وہ نہ ڈری لیکن جونہی اسے دور سے ایک مرد نظر آیا' وہ ڈر گئی لیکن ہمارے خیال میں آج کی عورت اتنی مرد سے نہیں ڈرتی جتنی دوسری عورت سے۔ سو یہ خبر پڑھتے ہی ہماری خواتین ہر قسم کے

خطرے سے نمٹنے کے لیے بیوٹی پارلروں پر ٹریننگ لینے جانے لگی ہیں۔ محترمہ بشریٰ رحمٰن تک میک اپ میں زیادہ دیر لگانے لگی ہیں۔ ہمیں امید تھی امجد حمید دستی صاحب ان دوشیزاؤں کو پنجاب میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے دستہ بن کر ان کا رستہ روک لیں گے لیکن لگتا ہے وہ خواتین کا رستہ روکنے کو بری بات سمجھتے ہیں۔ بہرحال ان حسیناؤں سے اپنے کنوارے وزیروں کی حفاظت کے لیے ہمیں کھر صاحب کی خدمات لینی چاہئیں تاکہ وہ ان حسیناؤں پر نظر رکھیں' ان سے زیادہ حسیناؤں پر پنجاب میں کون نظر رکھ سکتا ہے۔ بہرحال دستی صاحب کی ناخوشی کی وجہ شاید یہ واقعہ ہو جو بھارت کی مدھیہ پردیش کی اسمبلی میں پیش آیا۔ رکن اسمبلی گوپال نے حزب اختلاف کی مس کلیان پانڈے سے پوچھ لیا کہ آپ نام کے ساتھ جو مس لگاتی ہیں' وہ کیا مس کرنے کی طرف اشارہ ہے؟ جواب میں مس کلیان نے جوتی اتار کے انہیں دے ماری۔ وہ تو شادی شدہ تھے' سو ایسے حملوں سے بچنے کا تجربہ تھا۔ وہ تو بچ گئے مگر جوتی سیدھی وزیر برج بھوشن کے منہ پر لگی اور وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ پھر جب تک اسمبلی کی کارروائی چلی' جوتی ہی چلی۔ آخر میں وزیراعلیٰ لال پوار رونے لگ گئے جس کی وجہ سنا ہے یہ تھی ان کی نئی جوتی اس کارروائی میں گم ہو گئی تھی۔ بہرحال مدیہ پردیش اسمبلی میں ہتھیار لے کر آنے پر پابندی سخت کر دی گئی یعنی ارکان اسمبلی کو جوتے پہن کر اندر آنے کی اجازت نہ ہو گی۔ اسی لیے ہمارے ہاں پکے راگوں کی محفلوں میں حاضرین سے جوتے باہر ہی اتروا لیے جاتے ہیں۔ اس واقعہ کی روشنی میں دستی صاحب کا محتاط اور ناخوش ہونا سمجھ میں آتا ہے ورنہ دو سو دوشیزاؤں کے آنے پر کون ناخوش ہو گا۔ ویسے ہو سکتا ہے دستی صاحب اس پر اس لیے ناخوش ہوں کہ "صرف دو سو!"

○○○

- راہ زن

پطرس بخاری مرحوم نے اپنی کتاب کے دیباچے میں لکھا تھا: "اگر آپ نے یہ کتاب چوری کی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں۔" اگر انہیں آج یہ دیباچہ لکھنا پڑتا تو وہ یقیناً لکھتے: "جو اس کتاب کے نئے ایڈیشن کی ایک کتاب چرائے گا' اسے پہلے ایڈیشن کی دو کتابیں مفت دی جائیں گی۔" مگر قائداعظم لائبریری والوں کا ذوق ملاحظہ فرمائیں' انہوں نے لوکل گورنمنٹ کے پراجیکٹ ڈائریکٹر کو فارن کتاب چرانے پر راہزن قرار دے ڈالا اور حوالہ پولیس کر دیا۔ اگرچہ ہمیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ راہزن سے مراد تو راہ میں ملنے والی زن ہوتی ہے۔ اس سے مراد چور اچکا کیوں لیا جاتا ہے۔ اس پر خواتین کو احتجاج کرنا چاہیے کہ آئندہ چور اچکوں کو راہ زن کی بجائے راہ مرد کہا جائے بلکہ چور اچکوں کو خود اس پر کچھ مردانگی دکھانا چاہیے۔ جہاں تک کتاب چوری کا تعلق ہے تو اردو ادب میں دوسرے کی زیادہ سے زیادہ تعریف یہی کی جاتی ہے کہ وہ نظر میں دل چرا لیتا ہے۔ کتاب چور کو تو ادب میں بہت ہی بلند مقام حاصل ہے۔ ہم ایک ایسے شاعر کو جانتے ہیں جن کی کتاب کسی نے چرا لی تو وہ اسے بھی اپنے کلام کی خوبیوں میں شمار کرنے لگے۔ حالانکہ اگلے دن دیوان واپس مل گیا تھا اور اس میں سے وہی صفحے چرائے گئے تھے جو صاف تھے لیکن قائداعظم لائبریری والوں نے تو حد کر دی۔ ہم انہیں بدذوق بھی نہیں کہتے' کہیں کل بیان دے دیں کہ ہم نے استاد ذوق کو بد کہا۔ ویسے ہمیں تو لگتا ہے کہ کتاب چور پراجیکٹ ڈائریکٹر صاحب بھی کبھی کالج یا یونیورسٹی نہیں گئے کہ وہاں تو سکھایا ہی یہی جاتا ہے کہ کمرہ امتحان میں چوری چھپے کتاب کس طرح لے جا سکتے ہیں۔ چلو اگر وہی اناڑی تھے تو لائبریری والوں کو ہی خیال کرنا چاہیے تھا۔ ویسے ہو سکتا ہے انہوں نے موصوف کو صرف اس لیے پکڑا ہو کہ کتاب امریکی تاریخ کی تھی۔ لائبریری والوں نے سوچا ہو گا کہ اگر امریکہ

کی تاریخ چرا لی گئی تو پھر امریکہ کے پاس کیا رہ جائے گا؟ حالانکہ تاریخ کے معاملہ میں امریکہ پہلے ہی رہ گیا ہے۔ امریکہ کی نئی نسل سے تاریخ کا مطلب پوچھو تو وہ "ڈیٹ" بتاتے ہیں۔ سکول کے زمانے میں ہم بھی تاریخ کے لاجواب طالب علم تھے یعنی ہر سوال کا جواب لا میں دیتے۔ اب بھی ہم نے تاریخ یاد رکھنے کے لیے کمرے میں کیلنڈر لٹکایا ہوا ہے۔ بہرحال اتنا ہمیں پتہ ہے کہ امریکہ کی تاریخ بھی اپنی نہیں' چوری کی ہے۔ چوری کے معاملے میں وہ خود ایسے ہیں کہ ایک انگریز امریکی اور یہودی گرجا گھر دیکھنے گئے۔ انگریز نے وہاں لگے ہیرے دیکھ کر کہا "کتنے خوبصورت ہیرے ہیں' دل چاہتا ہے اتار لوں۔" امریکی نے کہا "میں نے تو اتار بھی لیے ہیں۔" یہودی بولا "اور اس وقت وہ میری جیب میں ہیں۔" اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ کولمبس نے امریکا کب دریافت کیا؟ تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو بتائے بغیر کیا! بہرحال کولمبس امریکا چھوڑ کر مرا۔ حالانکہ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ ہمارے دادا ساری دنیا چھوڑ کر مرے۔ اگرچہ تاریخ کی کتاب کے بغیر ہمیں بھی رات کو نیند نہیں آتی۔ تاریخ کی کتاب کھلی دیکھ کر فوراً آ جاتی ہے مگر ہم اتنے باذوق نہیں کہ کتاب چرانے کا سوچتے۔ بندہ فضول اور بے کار چیز خرید تو سکتا ہے' چرا نہیں سکتا۔ اسی لیے کتابیں بہت کم چرائی جاتی ہیں۔ آج کل کتابوں کا یہ معاملہ ہے کہ ایک روز پروفیسر عالم خان تیزی سے پاک ٹی ہاؤس سے نکل رہے تھے' کسی نے پوچھا "آپ گھبرائے ہوئے بھاگ کیوں رہے ہیں؟" تو بولے "اندر امجد طفیل لوگوں کو اپنی نئی کتاب دے رہا ہے' کہیں مجھے بھی نہ دے دے۔" آج کل ریڈر اتنے کم ہو گئے ہیں کہ مجسٹریٹ تک نے تنخواہ پر ریڈر رکھے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہمیں تو لائبریری میں وہی کتابیں پسند ہیں جن پر کتابی چہرے جھکے ہوتے ہیں۔ ایک بار ہم نے ایک اداکارہ سے "بک" کا ذکر کیا تو اس کی ماں بولی۔ "ہاں بے بی کئی فلموں میں "بک" ہے۔" اس دور میں پڑھنے کے لیے کتاب چرانا ایک کارنامہ ہے۔ ہماری حکومت نے جتنے انعام رکھے ہیں' چوروں' ڈاکوؤں پر رکھے ہیں اور اس حساب سے صرف سندھ میں 12 کروڑ روپے کے ڈاکو ہیں۔ تیس چالیس ہزار کے شریف بھی

ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ کتاب چوروں کے لیے بھی انعام رکھے۔ کم از کم جو کسی مصنف کی ایک کتاب چرائے‘ اسے مصنف کی دوسری کتاب انعام میں دی جائے۔ اگر وہ پھر بھی باز نہ آئے تو پڑھائی بھی جائیں۔

○○○

- ## ماحول لاحول

فخر امام صاحب نے کہا ہے کہ چالیس سال قبل بچوں پر کنٹرول کر لیا جاتا تو آج ماحول میں اتنی آلودگی نہ ہوتی۔ واقعی ہمارے اکثر ارکان اسمبلی اتنے سال قبل ہی پیدا ہوئے۔

اگرچہ ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ماحول بہتر بنانے کے لیے بچوں پر کنٹرول ضروری ہے۔ ان پر کنٹرول نہ کیا جائے تو بگڑ جاتے ہیں اور بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ بچے پیدا ہونے کے تو وہ خلاف ہو جو خود بچہ پیدا نہ ہوا ہو۔ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن لکھتے ہیں کہ آخری بچہ لاڈ پیار سے اکثر بگڑ جاتا ہے اور گھر کا ماحول خراب کرتا ہے۔ اس لیے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے آخری بچہ نہیں ہونا چاہیے۔

صاحب! محکمہ منصوبہ بندی تو ہمارے کلچر سے ہی لگا نہیں کھاتا۔ ہم نے تو کبھی کسی اور معاملے میں منصوبہ بندی نہیں کی یہ تو پھر اللہ کا معاملہ ہے۔ ہمارے ہاں تو محاورہ ہے' ایک اور ایک گیارہ جو کھلم کھلا محکمہ منصوبہ بندی کا مذاق ہے۔ یہ ہونا چاہیے تھا' ایک اور ایک زیادہ سے زیادہ چار۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں اس محکمہ کا اتنا کام ہے کہ کسی طالب علم سے مستقبل کی "منصوبہ بندی" کا پوچھ لو تو شرما کر کہے گا میری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ ہمارے ہاں ایک رکن اسمبلی نے ایک بار اسمبلی میں خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت میں بڑی ہی شاندار تقریر کی۔ جب اجلاس ختم ہوا تو اس کے گرد مبارکباد دینے والوں کا ہجوم تھا جو اس کے ہاں تین جڑواں بچے پیدا ہونے کی مبارکباد دے رہے تھے۔ مغرب میں تو جس کے دو سے زیادہ بچے ہوں' اسے معزز نہیں سمجھا جاتا۔ دو سے زیادہ والدین ہو سکتے ہیں۔ وہاں تو مرد بھی منصوبہ بندی کے لیے آپریشن کرا لیتے ہیں۔ ایک برطانوی سینٹر نے کہا "میں نے منصوبہ بندی کے لیے اپنا آپریشن بہت پہلے کرا لیا تھا مگر میں نے یہ بات اپنی بیوی کو اس وقت تک نہ بتائی جب تک ہمارے دو بچے نہ ہو گئے۔" اس کے باوجود وہاں پاکستان کی نسبت زیادہ تیزی سے بچے پیدا

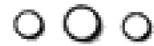
ہوتے ہیں۔ ایک مغربی ڈاکٹر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا "ہاں ہمارے ہاں شادی کے بعد پہلا بچہ کبھی کبھی چار پانچ ماہ بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایسا نہیں ہوتا۔"

پاکستانی کھلاڑی عمران خان نے کہا "شادیوں پر پابندی لگائی جائے تاکہ کم بچے پیدا ہوں۔" امریکی کھلاڑی نے کہا "غیر شادی شدوں پر پابندی لگائی جائے تاکہ کم بچے پیدا ہوں۔" لیکن جنوبی فلپائن نے کمال کر دیا۔ وہاں محکمہ منصوبہ بندی کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے مردوں نے بچے پیدا کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ سنا ہے یہ سب میٹرنٹی لیو حاصل کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔

مغربی پریس ماحول کا جو نقشہ کھینچتا ہے' اس سے ہول آتا ہے بلکہ ماحول پر لاحول بھیجنے کو دل چاہتا ہے۔ ہمیں تو یہ ماحول اتنا خراب لگتا ہے کہ اس ماحول میں ویسے ہی بچے پیدا نہیں کرنے چاہئیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں بھی ماحول ٹھیک رکھنے کے لیے ہر کوئی اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے ایک دوست سے پوچھا "تمہارے ساتھ اس دن جو خوبصورت خاتون تھی' وہ کون تھی؟" بولا "وعدہ کرو یہ بات تم میری بیوی کے سامنے نہیں کہو گے تاکہ گھر کا ماحول خراب نہ ہو۔" ہم نے وعدہ کیا تو بولے "وہ میری بیوی ہی تھی۔" ہمارے ایک جاننے والے گھریلو ماحول سے آلودگی ختم کرتے ہیں یعنی میرج کونسلنگ کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں انہوں نے میرج کونسلنگ کا اشتہار دیا اور ساتھ تجربہ پچیس سال لکھا۔ جی ہاں ان کی شادی ہوئے پچیس سال ہو گئے ہیں۔

جہاں تک ماحول بہتر بنانے کے لیے آبادی پر کنٹرول کرنا ہے تو ہمارے کئی اراکین اسمبلی ایسے ہیں جو کسی بھی آبادی پر ایک منٹ میں کنٹرول کر سکتے ہیں۔ ویسے بھی مغرب نے جب ابھی آبادی کے مسئلے پر سوچنا بھی شروع نہیں کیا تھا' ہمارے حکیم تب بھی آ....... بادی کی بجائے' جا....... بادی کا اہتمام کیا کرتے تھے مگر اس کے باوجود دنیا نے پاکستان کو Pollution Paradise قرار دے دیا ہے۔ سیاستدان اس پر شاید اس لیے

مطمئن ہیں کہ Pollution اسٹارٹ ہی Poll سے ہوتی ہے۔ پھر دنیا میں "زمین بچاؤ" تحریک تو اب چلی ہے۔ ہمارے جاگیردار اور وڈیرے سیاستدان تو ازل سے "زمین بچاؤ" تحریک میں لگے ہوئے ہیں۔ غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب سے ہم نے پوچھا "زمین کے تحفظ کی جو تحریک چلی ہے' اس میں آپ کا کردار کیا ہے؟" فرمایا "میرا کوئی کردار نہیں۔" ہم نے کہا "وہ پتا ہے مگر ہم زمین کے تحفظ کی تحریک کے حوالے سے پوچھ رہے ہیں؟" بولے "ہم تو زمین کے تحفظ کے لیے جانیں قربان کر دیتے ہیں۔" مغربی پریس شور مچا رہا ہے کہ اگر ہم نے دنیا کے ماحول کو آلودگی سے بچانے کے لیے کچھ نہ کیا تو پچاس ساٹھ سال کے بعد پانی پینے کے قابل اور ہوا سانس لینے کے قابل نہ رہے گی۔ شاید اسی لیے ہم لوگ کچھ نہیں کرتے۔ ہم تو گاتے ہیں "چاند میری زمین" اگر یہی حال رہا تو ایک دن ہماری زمین واقعی چاند بن جائے گی یعنی یہاں پینے کو پانی ہو گا نہ سانس لینے کے لیے آکسیجن۔



• جانِ من اور جان دو من

لیکچرار کی تعریف یہ ہے کہ وہ شخص جو دوسروں کی نیند میں بولتا ہے' لیکچرار کہلاتا ہے۔
ہم خود زمانہ طالب علمی میں کلاس روم میں سب سے پہلے جاتے تا کہ آخری بینچ پر جگہ مل جائے اور آرام سے لیکچر سے سن ہو سکیں۔ ایک دن ہم حسب معمول سوئے ہوئے تھے کہ ساتھ والے نے غصے سے ہلا کر کہا یار کلاس میں خراٹے تو نہ لو' ہماری بھی نیند خراب کرتے ہو۔ مگر جونہی کسی کونے سے محبوبہ کا لفظ سنتے تو سب ہاتھ اور آنکھیں ملتے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن ہم وزیراعظم جان میجر کی یہ بات سن کر حیران ہو گئے ہیں کہ وہ اپنی محبوبہ سے پہلی ملاقات کے دوران سو گئے۔ اگرچہ ہمیں اس بات کی سمجھ تو نہیں آئی البتہ یہ سن کر نیند ہی آنے لگی ہے۔

ہم لوگ اپنی محبوبہ کو "جان" کہتے ہیں جبکہ اہل برطانیہ اپنے وزیراعظم کو "جان" کہہ کر بلاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کی بیوی اس سے جھگڑ رہی تھی کہ یہ مجھے جان کہہ کر بلاتا ہے۔ ہم نے کہا اس میں اعتراض والی کیا بات ہے؟ بلکہ خوش ہونا چاہیے کہ وہ آپ کو اپنی جان کہتا ہے تو بولیں اعتراض یہ ہے کہ وہ کل اپنے باس کو کہہ رہا تھا کہ میں آپ کی خاطر اپنی جان دے سکتا ہوں۔ اگرچہ یہاں جان میجر کی جس جانِ من کا ذکر ہے' اسے آپ جان دو من بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہاں دو من سے محبوبہ کے وزن کی طرف اشارہ نہیں بلکہ یک جان دو قالب کا ترجمہ ہے۔

جان میجر بچپن میں سکول کے ایسے طالب علم تھے کہ ومبلڈن گرائمر سکول کا ٹیچر کہتا:
"جان کا دماغ دنیا کی طرح وسیع اور کھلا ہے یعنی جو بات یا پیغام ایک منٹ میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ سکتا ہے' اسے اس کے سر کے باہر سے اندر دماغ تک پہنچنے میں کئی منٹ لگتے ہیں۔ ایک بار استاد نے پوچھا "آج کیا ڈیٹ ہے؟" کہا "سر! معلوم نہیں۔" استاد نے کہا "یہ جو تمہارے پاس اخبار ہے اس سے

دیکھ کر بتاؤ۔" تو انھوں نے کہا "سر یہ تو کل کا اخبار ہے۔" جان میجر کو طالب علمی میں کبھی سونے کا موقع نہ ملا کیونکہ استاد ہمیشہ انہیں بنچ پر کھڑا رکھتے۔ سو ہو سکتا ہے کہ یہ کمی اب پوری کی جا رہی ہو نیند کوئی معمولی چیز تو نہیں۔ اس کی خاطر بندہ سارا دن جاگتا ہے۔ اگر وہ ہمارے ہاں کے ہوتے تو ہم کہہ سکتے تھے' وہ مشروب مشرق یعنی لسی پی کر سو گئے ہوں گے۔ ہمارے ہاں تو لسی کے اتنے بڑے گلاس ہوتے ہیں کہ ہم سے تو کبھی پورا گلاس نہ پیا گیا' ابھی آدھے پر ہی ہوتے ہیں کہ نیند آ جاتی ہے۔

جان میجر ہمیں اس لیے بھی پسند ہیں کہ ان میں یہ خاص بات ہے کہ وہ عام آدمی ہیں۔ کہتے ہیں مجھے بالغ ہوتے ہی ملازمت کرنا پڑی' حالانکہ انہیں ملازم ہوتے ہی بالغ ہونا پڑا۔ بس کنڈیکٹر بننا چاہتے تھے اور معیار پر پورے نہ اترے۔ بعد میں وزیراعظم بن گئے۔ اس لیے اب لندن میں جس کو بس کنڈیکٹری کی نوکری نہ ملے' وہ خود کو مستقبل کا وزیراعظم سمجھنے لگتا ہے۔ ایک بار ایک صحافی نے جان میجر کو دیکھتے ہوئے کہا "آپ اس بلندی پر کیسے پہنچے؟" تو انہوں نے کہا "دراصل بچپن ہی سے میرا قد تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔"

جان میجر کو سونا شاید اس لیے اچھا لگتا ہو کہ تمام سوئے سوئے لوگ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ موصوف کو بچپن ہی سے نیند یعنی سلیپ اتنی پسند تھی کہ ہر وقت سلیپر پہنے رہتے۔ لباس کو ذرا توجہ نہیں دیتے' اس لیے سب ان کے لباس کو ہی توجہ دیتے ہیں۔ انہیں 1991ء کا بدلباس قرار دیا گیا تو کسی نے پوچھا "لباس کے بارے میں آپ کی رائے؟" فرمایا "پہننا چاہیے۔" اکثر اس بات پر جھگڑنے لگتے ہیں کہ تم نے مجھے جھگڑالو کیوں کہا؟ یادداشت ایسی رہی کہ راستے میں کھڑے ہو کر سوچنے لگتے ہیں کہ محبوبہ کو ملنے جا رہا ہوں یا مل کر آ رہا ہوں۔ ایک کالمسٹ کے بقول اتوار کو ان کا دفتر اور دماغ بند ہوتا ہے۔ اگرچہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے بلکہ سولی پر پکی نیند آتی ہے لیکن عاشقوں میں ہمارے ہاں صرف ایک "مرزا" ہی گزرے ہیں جو ڈیٹ کے دوران سو گئے اور

"صاحباں" کے بھائی صاحباں کے ہاتھوں مارے گئے۔ تب سے ہمارے ہاں محبوبہ کا نام سنتے ہی عاشقوں کی نیندیں اڑ جاتی ہیں جس سے لگتا ہے کہ جان میجر عشق کو امتحان نہیں سمجھتے کیونکہ نیند تو آتی ہی امتحانوں میں ہے۔ یقین نہ آئے تو کسی طالب علم کو امتحان کے دنوں میں جگا کر پوچھ لیں۔ ہوسٹل تو سونے کی کانیں ہیں۔ گھروں میں طلباء امتحان کے دنوں میں رات گیارہ بجے سو کر بارہ بجے اٹھ پڑتے ہیں جبکہ ہوسٹلز میں بارہ بجے سو کر گیارہ بجے اٹھتے ہیں۔ ویسے بھی رچرڈ ہارڈنگ ڈیوس نے کہا ہے "کوئی مہذب آدمی جس روز سوتا ہے' اسی روز نہیں اٹھتا۔"

بور فلم' شخصیت اور کتاب بڑی نینڈ آور ہوتی ہے لیکن جان میجر کے بارے میں زیادہ جاننے کے لیے کسی نے جان میجر کی ایک واقف کار خاتون سے پوچھا "آپ تو ان سے اکیلے میں مل چکی ہیں' ان کی کچھ باتیں بتائیں گی؟"

اس نے کہا "جان نے بہت سی باتیں کی تھیں مگر مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کیونکہ مجھے نیند آنے لگی تھی۔"